یادگارِ غالب

غالب کی حیات اور فکر و فن پر
ایک لافانی کتاب

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

یادگارِ غالب

مولانا الطاف حسین حالیؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزّلِ غایت درجہ کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزّت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسنِ اتفاق سے دارالخلافہ دلّی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں۔ اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا **غالب** مرحوم فرماتے ہیں:

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی، وانگاہ   حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلّی جانا ہوا اُس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گئے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، مگر جو باقی تھے اور جن کو دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلّی سے، بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیوں کہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے، وہ سانچا بدل گیا اور جس آب و ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی، وہ ہوا پلٹ گئی:

زمانہ دگرگونہ آئیں نہاد   شد آں مُرغ کو بیضہ زرّیں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خان **غالب** جن کی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ اُن کو بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب مہر نیمروز میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ "شاہجہان کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا! مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں، تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔" اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رُتبے سے واقف نہیں، شاید خودستائی اور تعلّی پر محمول کریں گے؛ مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا؛ بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو اُن کے زمانے کے اہلِ نظر اور اہلِ تمیز ان کی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی۔ ان کا تمام کلام، اُردو، فارسی، نظم اور نثر ان کے جیتے ہی جی اطرافِ ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ ان کے ماننے والے اور مدّاح و ثناخواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں۔ مدحیہ قصائد پر ان کو کم و بیش صلے اور خلعت و انعام بھی ملتے رہے۔ مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق ان کی خاصی قدر کی۔ ریاست رامپور سے ان کے لیے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا۔ یہ سب کچھ ہوا؛ مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ مرتبے کا جو شاعری و انشاپردازی میں فی الواقع انھوں نے حاصل کیا تھا، ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اس پیرزال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی اٹی لے کر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا یا جہانگیر و شاہجہان۔ مگر جس قدر اس اخیر دور میں ان کو مانا گیا اس کو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے:

بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں
یہ دیکھا، تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا، مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارالخلافے کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا، اور اُردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے

عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور ان کی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آ سکیں اور ابنائے زمان کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلم بند کروں۔

پچھلے برسوں میں جب کہ میں دلّی میں مقیم تھا، بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سُراغ ملا، ان کو قلمبند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیبِ مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہو گیا، اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا، دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہو سکتی ہیں، ان کو اب زیادہ حالتِ منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں۔

میں نے ان مٹھوں کو کھولا اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا؛ مگر ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہوں گی۔ میں نے دلّی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور انھوں نے مہربانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات اُن کو معلوم ہو سکے لکھ کر میرے پاس بھیج دیے اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اس کی تکمیل ہو سکتی تھی، مکمل کی گئی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی مہتم بالشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں، ان کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں

پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے رُوپ میں، کبھی عشقبازی اور رندمشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوّف اور حُبِ اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا، اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحبِ کمال ایسے گزرے ہیں جن کے زمانے میں اُن کی قدر و منزلت کا پورا پورا اندازہ نہیں کیا گیا، مگر آخرکار ان کا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اس کے اکثر ہم عصر امامی ہروی کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ مگر کچھ بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ سعدی کا نام اور اس کا کلام اطرافِ عالم میں منتشر ہو گیا اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا۔ شکسپیر کے عہد میں اس کو ایک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیر کے ورکس بائیبل کے ہم پلّہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں؛

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن — ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است — شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا جاتا ہے اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اُس کے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی، یہ امید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آیندہ زمانے میں مقبولِ خاص و عام ہوگی، لیکن جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر اُن کی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوئے، کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔

مرزا کو بحیثیت شاعر پبلک سے روشناس کرنے اور ان کی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ ان کے اصنافِ کلام میں سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا۔ ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں؛ جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی و معنوی خوبیاں، نزاکتیں اور باریکیاں

ظاہر کی جاتیں، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے، اس طبقے کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا۔ ان کی غزل سے مرزا کی غزل کو، قصیدے سے قصیدے کو، اور اسی طرح ہر صنف سے اسی صنف کو ٹکرایا جاتا، اور اس طرح مرزا کے پایۂ شاعری اور ان کے کلام کی حقیقت سے اہلِ وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنّف کے حق میں دشوار گزار تھا، اُسی قدر پبلک کے لیے، خاص کر اس زمانے میں، غیر مفید بھی تھا۔ اگر ہم اس دشوار گزار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزا نہ آیا۔"

ناچار ہم نے بجائے طریقۂ مذکورہ کے جو حالتِ موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے، اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے، جو ہمارے لیے سہل تر اور پبلک کے لیے مفید تر معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے: نظمِ اُردو، نثرِ اُردو، نظمِ فارسی اور نثرِ فارسی؛ اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے۔ ہر قسم پر اوّل کچھ مختصر ریمارکس کیے ہیں، پھر اس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں، ان کی جا بجا شرح بھی کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں محاسنِ کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں خاص کر ان لوگوں کے لیے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت استادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال بہم پہنچایا تھا۔

مذکورۂ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جس قدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے وہ سب لے لیے گئے ہیں، اور جو اُن سے پست درجے کے خیالات تھے وہ چھوڑ دیے گئے ہیں؛ نہیں، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بمقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور ان کی فہم سے بعید تر نہ ہو۔ اور باوجود اس کے مؤلّف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جس کو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے، کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ شعر کی سمجھ اور اس کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں، ان کو بغیر اس کے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو، مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائے گا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، وہ بسبب اس کے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کر دیے گئے ہیں، مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مرزا نے قوتِ متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا، اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے: پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات جہاں تک کہ معلوم ہو سکے، اور ان کے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے انھیں حالات کے ضمن میں ان کی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں اور ان کے لطائف و نوادر، جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور ان کی امیجینیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے، اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلامِ نظم و نثر، اُردو اور فارسی کا انتخاب، اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو، اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم الثبوت استادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور ان کی طرزِ شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے جس کو ساری کتاب کا لبِ لباب سمجھنا چاہیے۔

اگرچہ مرزا کی لائف، جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے، ان فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرافی سے حاصل ہونے چاہییں: لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کی جائے، تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو، ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اس کے سوا ہر قوم میں عموماً، اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات سے اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو، ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، ان

کے ورکس میں چھان بین کرنی اور ان کے نوادر افکار سے مستفید ہونا قوم کے ان فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لیے نہات افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں:

> حیف کہ ابنائے روزگار حسن گفتار مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آنان می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند، و ازیں نمایشہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام، سرگراں گزشتند۔

یادگارِ غالب

(حصّہ اُردو)

ترتیب

حصہ اوّل — اُردو

دیباچہ
آغازِ کتاب
تاریخِ ولادت، خاندان
تاہل
مسکن۔ مطالعۂ کتب۔ سفرِ کلکتہ
مجادلۂ اہلِ کلکتہ
قیامِ لکھنؤ
ملازمتِ سرکاری سے انکار
قید ہونے کا واقعہ
قلعہ کا تعلق
خدمتِ اصلاحِ اشعارِ بادشاہ۔ بدیہہ گوئی
اولاد
عارف کا مرثیہ۔ حالاتِ غدر۔ کتاب دستنبو
وظیفۂ رامپور
قاطعِ بُرہان
قاطعِ بُرہان کی مخالفت اور اُس کی وجہ
قاطعِ بُرہان کی تائید
گمنام خطوں میں گالیاں
عربی استعداد، فارسی دانی، عروض
نجوم، تصوّف اور تاریخ
خط۔ شعر خوانی
مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات۔
وسعتِ اخلاق
مروّت۔ فراخ حوصلگی
شعر فہمی
کتاب فہمی۔ حسنِ بیان اور ظرافت
خودداری
خوراک، آموں کی رغبت۔ حسنِ طلب
ناؤ نوش
اسلام کا یقین
شوخیِ بیان
بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا

سلامتی طبع
مسئلہ امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین
دادِ سخن
تقریظ لکھنے کا ڈھنگ۔ تقریظ دیوانِ تفتہ
تقریظ تصحیحِ آئینِ اکبری
محققانہ نظر
حق پسندی
راست گفتاری
ناقدر دانی کی شکایت
اپنے عجز کا اقرار
ہجو نہ لکھنا
خانگی تعلقات
موت کی آرزو
اخیر عمر کی حالت۔ مرض الموت کی حالت
تاریخِ وفات۔ جنازے کی نماز
شاگردوں کی کثرت
نواب ضیاء الدین احمد خان
نواب محمد مصطفیٰ خان

دوسرا حصّہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب

تمہید۔ استعدادِ سبق
دیوانِ ریختہ
فطرتِ انسانی
شکایتِ اہلِ وطن
حسنِ بیان کی تعریف
دوسری خصوصیت
تیسری خصوصیت۔ چوتھی خصوصیت
غزل بہاریہ۔ شکرِ صحتِ بادشاہ

قطعات

رباعیات

نثرِ اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغازِ کتاب

تاریخِ ولادت مرزا اسد اللہ خان **غالب** المعروف بہ میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شبِ ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔

خاندان مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال، جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا ظاہر کیا ہے، یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلۂ نسب تور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا تو ایک مدتِ دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی؛ کیوں کہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا؛ اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بختِ خفتہ نے پھر کروٹ بدلی اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشیائے کوچک) پر حکمران رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر و پراگندہ ہو گئی۔ انھیں میں سے **ترسم خان** نام ایک امیر زادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے، وہ اسی **ترسم خان** کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہرِ نیمروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ازوالپسیانِ ایں قافلہ نیاے من، کہ در قلمروِ ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراسِ وے بود، چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید، از سمرقند بہ ہند آمد۔

اور درفشِ کاویانی میں اس طرح لکھا ہے:

> بالجملہ سلجوقیاں بعدِ زوالِ دولت و برہم خوردنِ ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضاے ماوراء النہر پراگندہ شدند۔ ازاں جملہ سلطان زادہ **ترسم خان** کہ ما از تخمۂ اویم، سمرقند را بہرِ اقامت گزید۔ تا در عہدِ سلطنتِ شاہ عالم نیاے من از سمرقند بہ ہندوستان آمد۔

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخلِ کلّی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوایا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا۔ ان کے کئی بیٹے تھے، جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں: ایک مرزا کے باپ **عبداللہ بیگ خان** عرف **میرزا دولھا** اور دوسرے **نصراللہ بیگ خان**۔ عبداللہ بیگ خان کی شادی **خواجہ غلام حسین خان** کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائدِ شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان نے بطور خانہ داماد کے تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کے دو بیٹے ہوئے: ایک مرزا اسداللہ خان، اور دوسرے مرزا یوسف خان جو ایامِ شباب میں مجنوں ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خان، جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے، اول لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور سرکارِ آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے، مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی، اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی، اس کے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خان کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا، اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ راجا بختاور سنگھ رئیسِ الور نے دو گانوں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کے واسطے مقرر کر دیا، جو ایک مدتِ دراز تک جاری رہا۔ مرزا کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ خان نے ان کو پرورش کیا۔

جب سرکارِ انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی اور نواب فخر الدولہ احمد بخش خان لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے تو انھوں نے مرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان کو، جن سے نواب موصوف کی ہمشیرہ منسوب تھیں، سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالداری ملازم کرا دیا۔ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا، جو نواحِ آگرہ میں واقع ہیں، سرکار سے ان کے نام پر مقرر ہوگئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے ان کے نامزد رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ سے مقرر کرادیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتحِ دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہوگئی، تو پنشن پھر جاری ہوگئی، اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلقِ خاطر رہا۔

لطیفہ اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں: "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا، تو غم تو ہے۔"

مرزا نے اپنے علوِ خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے۔ چوں کہ ان میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں، اس لیے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں:

قطعہ

غالب! از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فنِ آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم
در معنی سخن گزاردۂ — خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیضِ حق را کمینہ شاگردیم — عقلِ کل را بہینہ فرزندیم

ہم بہ تابش، بہ برق ہمنفسیم ہم بہ بخشش، بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست، فیروزیم بمعاشے کہ نیست، خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی! چو من پشنگی و افراسیابیم دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم ست
میراث جم کہ مے بود، اکنوں بمن سپار زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم ست

رُباعی

غالب! بگہر ز دودۂ زادشمم زاں رو بصفای دمِ تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی، زدم چنگ بشعر شد تیرِ شکستہ، نیاگاں قلمم

تعلیم مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے؛ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلّی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک ان کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور **شیخ معظّم**، جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلّموں میں سے تھے، ان سے تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد ایک شخص پارسی نژاد، جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں **ہُرمزد** تھا اور بعد مسلمان ہونے کے **عبد الصّمد** رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا، جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلّی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ "مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبد الصّمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ مجھ کو لوگ بے اُستادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔" مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصّمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جا بجا اس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اس کو بلفظ تیمسار، جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے، یاد کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبد الصّمد ان کے مکان پر وارد

ہوا ہے۔ اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گذری تو عبدالصمد اور ان کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

ایک جگہ مرزا نے مبدا فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے۔ اور وہ شعر یہ ہے:

آنچہ در مبدا فیاض بود آنِ من ست　　گُل جدا ناشدہ از شاخ، بدامانِ من ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

باخذِ فیض زمبدا، فروزم از اسلاف　　کہ بودہ ام قدرے دیر ترِ دداں در گاہ

ظہورِ من بجہاں در ہزار و بست و دو ست　　ظہورِ خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

ملّا عبدالصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اس کی مادری زبان، اور اس کی قوم کی مذہبی زبان تھی، عربی زبان کا بھی، جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے، بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اس کی صحبت بہت کم میسر آئی، مگر مرزا جیسے جوہرِ قابل کو صغر سن میں ایسے شفیقِ کامل، اور جامع اللسانین استاد کا مل جانا ان نوادر اتفاقات میں سے تھا، جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر اس کے فیضِ صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر ست، و اگر حاصل نشود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر۔" معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے حسنِ قابلیت اور حسنِ استعداد نے ملّا عبدالصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفٰے خان مرحوم کہتے تھے کہ ملّا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، یہ فقرہ لکھا تھا "اے عزیز ما چہ کسی کہ بایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گذری۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا، اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر

ہوتا ہے، اُس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار، جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے، اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اوفیٰ نشین کردی تھیں۔

تاہل چوں کہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب **فخر الدولہ** کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لیے ان کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی **مرزا الٰہی بخش خان** معروف کے ہاں قرار پائی؛ اور جیسا کہ مرزا نے ایک رقعے میں اشارہ کیا ہے، تیرہ برس کی عمر میں سات رجب ۱۲۲۵ ہجری کو ان کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے ان کی آمد و رفت دلّی میں زیادہ ہو گئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلّی ہی میں رہے۔

مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی۔ وہ منشی شیو نرائن رئیسِ آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو، تو معلوم ہوا کہ میرے فرزندِ دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم! مجھ سے سنو! تمہارے دادا عہدِ نجف خان میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خان کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی، اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خان صاحب کے ساتھ ہیں، اور انھوں نے جو کیتھم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں، اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے: شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس[۱۹] بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چوں کہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا

گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے، جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی، اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا، اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اُس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا، اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خان نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیشدست رہتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ اُگاہ کر جمع کرواتا تھا۔ بھائی، تم سنو تو سہی! تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا۔ علاقے مول لیے تھے اور زمیندارہ اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگذاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال از رُوے تفصیل جلد مجھ کو لکھو۔" اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جس کی بدولت ان کے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگذار بن گئے تھے، اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے الّلے اور تلّلوں میں بسر ہوا تھا۔

اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا، ان سے سُنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی جب کہ راقم نے پہلے ہی بار اُن کو دیکھا ہے حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلّتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چوں کہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے، اس حالت میں بھی وہ ایک نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

مسکن دلّی میں ان کے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں انھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا، ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں رہا کیے، یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایے کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اُکتا یا، اُسے چھوڑ کر دوسرا

مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خان کے پھاٹک یا اس کے قُرب وجوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا، حکیم محمود خان مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں:

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مطالعۂ کتب

جس طرح مرزا نے رہنے کے لیے تمام عمر مکان نہیں خریدا، اسی طرح مطالعے کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزاری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی، الّا ماشا اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرایے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا، مرزا صاحب بھی ہمیشہ اسی سے کرایے پر کتابیں منگواتے تھے؛ اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفرِ کلکتہ

ظاہرا مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے وفات پائی تھی، اس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور ان کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خان کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے، جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے، جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محوّل کر دی تھی، جب تک مرزا صغیر سن رہے، جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی، عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا لاچار فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ اوّل مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آ گیا تھا، اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا۔ مرزا جیسے آزاد منش کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا۔ اس کشمکش میں ان کو اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچ کر

سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "ہنگامۂ دیوانگیِ برادر یک طرف و غوغائے وام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب و نگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ با لبے از سخن دوختہ و چشمی از خویش فروبستہ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم، و از بیدادِ روزگار نالان و سینہ بردمِ تیغ مالان بہ کلکتہ رسیدم۔"

غرض کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ کلکتے میں لوگوں نے ان کی بہت خاطر و مدارات کی اور ان کو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جن کی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ ان کے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا تھا کہ تمھارا حق ضرور تم کو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اس وقت دلی میں رزیڈنٹ تھے انھوں نے دلی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے۔ مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے اور انھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں، مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی، اس کی مفصل کیفیت، جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی، گورنمنٹ میں بھیج دی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انھوں نے ولایت میں اپیل کیا، مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں: ایک تو یہی کہ ان کے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آیندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے، اس کی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروزپور سے دلوائی جائے۔ چوں کہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی اس لیے دوسری درخواست کیوں کر منظور ہوتی! تیسری درخواست یہ تھی کہ کل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے، وہ اور شرکا سے علیحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروزپور سے

خزانۂ سرکار میں منتقل ہو جائے تاکہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے۔ (یہ دونوں درخواستیں منظور ہو گئیں اور ان کے موافق اخیر تک عملدرآمد رہا۔) پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا، لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے ان کو "خان صاحب بسیار مہربانِ دوستان" لکھا جاتا تھا؛ اور جب کبھی دلّی میں والسرائے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو اُن کو بھی مثلِ دیگر رؤسا و عمائدِ شہر کے بلایا جاتا تھا اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کے ان کو برابر ملتا رہا اور تمام لوکل حکام اور افسر ان سے رئیس زادوں کی طرح ملتے رہے۔

مجادلۂ اہلِ کلکتہ کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سند میں پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں: میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔" اسی لیے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہلِ زبان کے سوا کسی کے قول کو قابلِ استناد نہیں سمجھتا اور اپنے کلام کی سند میں اہلِ زبان کے اقوال پیش کیے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضات کی بوچھار پڑنے لگی۔ اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتہ میں بہت تھے، مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جزبز ہوتے تھے، ان کے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ انھوں نے تنگ آ کر ایک مثنوی موسوم بہ بادِ مخالف، جس میں اپنی غربت و بیکسی کا ذکر اور اہلِ کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور ان کے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درد انگیز طریقے سے بیان کیے ہیں، لکھی۔ یہاں اس مثنوی کے کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کیے جاتے ہیں:

اے تماشائیانِ بزمِ سخن! وے مسیحا دمانِ نادرہ فن!
اے گرانمایگانِ عالمِ حرف! خوش نشینانِ این بساطِ شگرف.

ای سخن پرورانِ کلکته! وی زبان آورانِ کلکته!
هر یکی صدرِ بزمِ آگهی شمعِ خلوت سرای آگهی

هر یکی پیش تازِ قافله هر یکی کدخدای مرحله
ای به شغلِ وکالت آماده دادِ غمخواریِ جهان داده
ای شگرفانِ عالمِ انصاف بسفارت رسیده از اطراف
ای سخن را طرازِ جان داده صفحه را سازِ گلستان داده
عطر بر مغزِ گیتی افشانان پهلوانانِ پهلوی دانان
ای گرامی فنانِ ریخته گو! نغز دریا کشانِ عربده جو!
ای رئیسانِ این سوادِ عظیم! وی فراهم شده ز هفت اقلیم!
همچو من آرمیدهٔ این شهر بهرِ کاری رسیدهٔ این شهر
اسدالله بخت برگشته در خم و پیچ عجز سرگشته
گرچه ناخواندهٔ مهمانِ شماست بی سخن ریزه چینِ خوانِ شماست
به تظلم رسیده است این جا با امید آرمیده است این جا
آرمیدن دهید روزی چار خسته را به سایهٔ دیوار
کارِ احباب ساختن رسم است میهمان را نواختن رسم است
آن ره و رسمِ کارسازی کو شیوهٔ میهمان نوازی کو
کیستم؟ دل شکستهٔ شب زده بیدلی خسته و ستم زده
برقِ بیطاقتی بجان زده آتشِ غم بخان ومان زده
ازدم از نفس بتاب و تب در بیابانِ یأس تشنه لبی
خسِ طوفانیِ محیطِ بلا سر بسر گردِ کاروانِ فنا
دردمندی، جگر گداخته از غمِ دهر زهره باخته
درِ آگاهی فنا زده همه بر خویش پشتِ پا زده
چه بلاها کشیده ام آخر که بدین جا رسیده ام آخر
به سیه روزِ غربتم بینید تیره شبهای وحشتم بینید
اندهِ دوریِ وطن نگرید غمِ هجرانِ انجمن نگرید

نہ ہمیں نالہ و فغان بلبم
من و جان آفرین کہ جان بلبم
مویہ چوں موے کردہ ست مرا
غصۂ بدخوے کردہ است مرا
ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا!
کے زبانِ سخن سراست مرا!
دارم آرے ز ہرزہ لائیِ خویش
نوحہ بر خویش و بینوائیِ خویش
گردشِ روزگارِ خویشتنم
حیرتِ کاروبارِ خویشتنم
با من این خشم و کین! دریغ دریغ
من چنان تا چنین! دریغ دریغ
بر غریبان کجا رواست ستم؟
رحم اگر نیست خود، چراست ستم؟

. . . .

بندہ ام بندہ، مہرباناں را
رمز فہمان و نکتہ داناں را
نہ ز آویزشِ بیاں ترسم
من و ایمانِ من، کزاں ترسم
کہ پس از من بسالہاے دراز
بزبان ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود اینجا
چند روز آرمیدہ بود اینجا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت
زحمتے داد و راہِ خویش گرفت
شوخ چشمے و زشت خوے بود
بے حیاے و ہرزہ گوے بود
ہم سفیہانہ گفتگوے داشت
ہم خراباتیانہ ہوے داشت
برگِ دنیا، نہ سازِ دینش بود
ننگِ دہلی و سرزمینش بود
آہ! ازاں دم کہ بعدِ رفتنِ من
خونِ دہلی بود بگردنِ من
تا بوم، رنجِ دوستاں باشم
بر دلِ انجمن گراں باشم
شاد گردند کز میاں بروم
آدخ از من کہ من چناں بروم

خستہ و مستمند بر گردم
دژم آیم، نژند بر گردم
بہ وداعم کس از شما نرسد
شوق را مژدۂ وفا نرسد
دوستاں را اگر ز من گلہ است
کہ خرامت خلافِ قافلہ است
می رویم از پے قتیل ہمہ
ساختہ مرو را دلیل ہمہ
تو ازیں حلقہ چوں بدر زدۂ
گام بر جادۂ دگر زدۂ؟
اے تماشائیانِ طرف نگاہ!
ہاں بگوئید، حسبۃً للہ!

کہ چناں از حزیں بہ پیچم سر   آں بجادو دمی، بدبیر سمر
دل دہد کز اسیر برگردم   زاں نوآیین صفیر برگردم
دامن از کف کنم چگونہ رہا   طالب و عرفی و نظیری را
خامہ رنج و روانِ معنی را   آں ظہوری، جہانِ معنی را
آنکہ از سرفرازیِ قلمش   آسماں ساست پرچم علمش
طرزِ اندیشہ آفریدۂ اوست   در تنِ لفظ جاں دمیدۂ اوست
پشتِ معنی قوی ز پہلویش   خامہ را فربہی ز بازویش
طرزِ تحریر رانوی ازوے   صفحہ ارتنگِ معنوی ازوے
فتنۂ گفتگوے اینانم   مستِ لاے سبوے اینانم
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را
لیک بایں ہمہ کہ ایں دارم   گنجِ معنی در آستیں دارم
دل و جانم فداے احبابست   شوق وقفِ رضاے احبابست
میشوم خو [illegible] صبح لیل   می سرایم نواے مدحِ قتیل
تا نماند ز من دگر گلہ   رسد از پیرزانِ وے صلہ
گفتن آیینِ ہوشیاری نیست   لیک دانستن اختیاری نیست
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت   سعدیِ ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است   از من و ہمچو من ہزار بہ است
من کفِ خاک او سپہرِ بلند   خاک را کے رسد بچرخ کمند
وصفِ او حدِ چوں منی نبود   مہر در خوردِ روزنی نبود
مرحبا سازِ خوش بیانیِ او   حبذا شورِ نکتہ دانیِ او
نظمش آبِ حیات را ماند   در روانی فرات را ماند
نثرِ او نقشِ بالِ طاوس است   انتخابِ صراح و قاموس است
پادشاہے کہ در قلمروِ حرف   کردہ ایجاد نکتہ ہاے شگرف
خامہ بندوے پارسی دانش   ہندیاں سر بخطِ فرمانش
ایں رقم ہا کہ ریخت کلکِ خیال   بود سطرے ز نامۂ اعمال

از منِ نارسائے ہیچمداں معذرت نامہ ایست زی یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما رحم بر ما و بیگناہیِ ما
آشتی نامۂ وداد پیام ختم شد، والسلام والاکرام

قیامِ لکھنو جب مرزا نے دلّی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اُس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں اس لیے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اس زمانے میں نصیرالدین حیدر فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہلِ لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوانِ شایستہ ان کی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا، مگر ایک مدحیہ نثر صنعتِ تعطیل میں، جو ان کے مسودات میں موجود ہے، نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اس کے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں، وہاں سے کلکتے کو روانہ ہو گئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ دلّی سے نصیرالدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوست کے توسط سے گزرانا تھا، اور اس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے، تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دے کر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ مرزا صاحب نے یہ سن کر پھر کچھ تحریک کی۔ مگر تین دن بعد یہ خبر پہنچی کہ نصیرالدین مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی اور پانچسو روپے سالانہ ہمیشہ کے لیے وہاں سے مقرر ہو گئے، لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی اور وہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا۔

لطیفہ لکھنؤ کی ایک صحبت میں جب کہ مرزا وہاں موجود تھے، ایک روز لکھنؤ اور دلّی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر

اہلِ دہلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں وہاں اہلِ لکھنؤ "آپ کو" بولتے ہیں! آپ کی نظر میں فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں: اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں، تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سن کر پھڑک گئے۔ مرزا کا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ "آپ کو" مخاطب کے لیے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے۔ اگر متکلم کے لیے بھی اس کا استعمال ہوگا تو بعض موقع پر التباس واقع ہوگا۔ اس مطلب کو انھوں نے اس لطیف پیرایے میں بیان کیا۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہلِ صحبت کے خوش کرنے کے لیے تھا ورنہ اہلِ دہلی بھی اکثر بجائے "اپنے تئیں" کے "آپ کو" بولتے ہیں۔ اس میں کچھ اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ

زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں۔ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ "حضرت! رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟" آپ نے کہا: بھیّا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

ملازمتِ سرکاری سے انکار

تذکرہ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں جب کہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاعِ شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے، مدرسین کے امتحان کے لیے دلّی میں آئے، اور چاہا کہ جس طرح سو روپے ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے، اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خان اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی، انھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں کھڑے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکریٹری ان کے لینے کو آئیں گے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو

معلوم ہوا کہ اس وجہ سے نہیں آئے۔ وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں، اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو، نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا: ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا، مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے؛ اور یہ کہہ کر چلے آئے۔

قید ہونے کا واقعہ

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے، برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔ مرزا نے خود اس واقعے کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں:

> کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف؛ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودے کہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودے کہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا، اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا، اس نے اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا، مگر کسی نے نہ سنا، اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی، تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا، اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا، یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے، اس پر راضی ہوں، مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں اب دنیا میں نہ رہوں؛ اور اگر رہوں، تو ہندوستان میں نہ رہوں؛ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی

جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے، جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گذرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو ان کو قید خانے میں گذرے، ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی، وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے، جیسے گھر پر رہتے تھے؛ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسبِ دلخواہ گھر سے ان کو پہنچتی تھیں، ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف بطور نظربندوں کے جیل خانے کے ایک علحدہ کمرے میں رہتے تھے، مگر چوں کہ اس وقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اس کو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ترکیب بند انھوں نے قید خانے میں لکھا تھا اس میں کہتے ہیں:

راز دانا! غمِ رسوائیِ جاوید بلاست — بہرِ آزار غم از قیدِ فرنگم نہ بود
جورِ اعدا رود از دل بہ رہائی، لیکن — طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نہ بود

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے اس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔ اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر ان کی غمخواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں مصروف رہے۔ چنانچہ اسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں:

خود چرا خوں خورم از غم کہ بغمخواریِ من — رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ منست
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ منست

لطیفہ جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں آ کر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد

دی۔ مرزا نے کہا: "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے: پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔"

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسبِ حال لکھ کر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اس نظم میں کل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیاتِ فارسی میں اس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا۔ مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ "سبد چین" شائع کیا تھا۔ اُس میں اس ترکیب بند کو بھی شائع کر دیا تھا۔ لیکن "سبد چین" کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی اس لیے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا۔ چونکہ یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اس واسطے اس کے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

از بند اوّل

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم   غمِ دل پردہ دری کرد، فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب   خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم   چوں نویسم غزل، اندیشہ ز غماز کنم
یارِ دیرینہ! قدم رنجہ مفرما کاینجا   آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
اہلِ زنداں بہ سر و چشم خودم جا دادند   تا بدیں صدر نشینی، چہ قدر ناز کنم
بلہ دزدانِ گرفتار! وفا نیست بشہر   خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنم

از بند سوم

پاسباناں! بہم آیید کہ من می آیم   درِ زنداں بکشایید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے   خیر مقدم بسرایید کہ من نی آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہِ شما می ترسم   راہم از دور نمایید کہ من می آیم
رہروِ بادۂ تسلیم درشتی نکند   سخت گیرندہ چرایید کہ من می آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید   بختِ خود را بستایید کہ من می آیم
تا بدروازۂ زنداں پےِ آوردنِ من   قدمے رنجہ نمایید کہ من می آیم

چوں سخن سنجی و فرزانگی آیینِ من ست   بہرہ از من بربایید کہ من می آیم

از بندِ چہارم

آنچہ فرداست، ہم امروز در آمد گویی   آفتاب از جہتِ قبلہ بر آمد گویی
دل و دستے کہ مرا بود، فرو ماند ز کار   شب و روزیکہ مرا بود سر آمد گویی
بہرۂ اہلِ جہاں چوں ز جہاں درد و غم است   بہرۂ من ز جہاں بیشتر آمد گویی
خستن و بستنِ من جز عبس نیست برو   بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گویی
ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع   خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گویی
چرخ یک مردِ گرانمایہ بہ زنداں خواہد   یوسف از قیدِ زلیخا بدر آمد گویی

از بندِ ہفتم

ہمدماں! در دلم از دیدہ نہانید ہمہ   غالبِ غمزدہ را روح و روانید ہمہ
للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ   للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ
من بخوں خفتہ و بینم، ہمہ بینید ہمہ   من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ
درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بودست   من برانیم کہ بر آئینہ برانید ہمہ
روزے از مہر نگفتید: فلانی چون ست؟   بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
چارۂ گر نتواں کرد، دعائے کافیست   دل اگر نیست خداوندِ زبانید ہمہ
ہفت بنداست کہ در بندِ رقم ساختہ ام   بنویسید و ببینید و بخوانید ہمہ
آں نہ باشم کہ بہ ہر بزم زمن یاد آرید
دارم امید کہ در بزمِ سخن یاد آرید

قلعہ کا تعلق ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقومِ جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائلِ مروارید کے دربارِ عام میں مرحمت فرمایا اور خاندانِ تیمورہ کی تاریخ نویسی کی خدمت پر مشاہرہ پچاس روپے ماہوار کے مامور کیا اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کر کے مرزا کے حوالے کیا کریں، اور مرزا ان تمام مطالب کو اپنی طرزِ خاص کی فارسی

نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دو حصوں پر تقسیم کی جائے: پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتدائے آفرینش سے صاحبقران تیمور گورگان تک، اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانہ تک بیان کیے جائیں اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کیے جائیں۔

مرزا نے تمام کتاب کا نام **پرتوستان** اور اس کے پہلے حصے کا نام **مہر نیم روز** اور دوسرے حصے کا نام **ماہ نیم ماہ** تجویز کیا تھا۔ ان کو اپنی دو ترکیبوں پر ناز تھا: ایک ماہ نیم ماہ اور دوسرے رستخیز بیجا۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دو ہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا؛ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصہ یعنی ماہِ نیم ماہ بالکل نہیں لکھا گیا۔ مہر نیم روز کے ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لیے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہو گیا اور اس حصے کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہِ نیم ماہ کو طلب کیا تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ماہِ نیم ماہ اسمیست کہ مسمیٰ ندارد، چوں از سرنوشت گردن نتواں پیچید، سرگزشت بازگویم۔ ہرگاہ یک نیمہ از **پرتوستان** انجام یافت و مہر نیم روز نام یافت، نخستی درنگ ورزیدہ شد تا نفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کارفرمارا روز فرو رفت و روزگار سرآمد، و دولت دیرینہ ترکمانانِ قراچاریہ سپری گشت۔ ماہِ نیم ماہ ہمچوں ماہِ بست و ہشت شبہ ناپدیدار، و نامش بعنوانِ بے نشانی در مہر نیم روز آشکار ماند۔

خدمتِ اصلاحِ اشعارِ بادشاہ

۱۲۷۱ھ میں جب کہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا، بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوانِ عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا: ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی

سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذات رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں، وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اس کو کھولا تو اس میں سے آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے۔ اور اسی وقت قلم دوات منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوبدار کے حوالے کیں۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں ان کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشّاق استاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دے کر درست کر دے۔ جب چوبدار غزلیں لے کر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدّت کے بعد سبکدوشی ہوئی ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرزِ خاص میں لکھتے تھے، نظم ہو یا نثر، اس کو بڑی کاوش اور جانکاہی سے سرانجام کرتے تھے، چنانچہ خود انھوں نے جابجا اس کی تصریح کی ہے۔ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی اس وقت ان کو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔

بدیہہ گوئی

۱۸۶۷ء میں جب کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے، مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا، شعراء کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا: "فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔" اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا کہ جب فیضی پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے: "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں، تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔" مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا، جو ان کے دیوانِ ریختہ میں موجود ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیے

اولاد

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لیے ایک مدّت سے وہ اور ان کی بی بی

تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر سے چند سال پہلے جب کہ ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خان عارف کا انتقال ہوگیا اور ان کے دونوں بچے ایک باقر علی خان اور دوسرے حسین علی خان صغیر سن رہ گئے تو مرزا اور ان کی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خان کو جو اس وقت بہت کم عمر تھا، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا حسین علی خان کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ نازبرداری کرتے تھے۔

جب زین العابدین خان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو حسین علی خان کے بڑے بھائی باقر علی خان کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونوں خوش فکر اور اہل اور نیک خو اور نہایت شریف مزاج تھے۔ مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہوگئے۔

عارف کا مرثیہ

زین العابدین خان عارف سے مرزا کو نہایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ اور باوجود پرگوئی کے نہایت خوش گو تھے، ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لیے جب وہ جوان عمر میں فوت ہوگئے تو مرزا اور ان کی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے ان کے مرنے پر ایک غزل بطور نوحے کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اس کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ، کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں، اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چاردہم تھے، مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے، داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا، کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور؟
گزری نہ بہر حال یہ مدت، خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہو، غالب!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حالاتِ غدر، کتاب دستنبو

غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے، بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔ جونہی بغاوت کا فتنہ اٹھا، انھوں نے دروازہ بند کر لیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے۔ اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خان مرحوم اور اُن کے ہمسایوں کے مکان پر جس میں ایک مرزا بھی تھے، حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اس لیے وہ فتح مند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے۔ مگر پھر ان کو طرح طرح کی کلفتیں اٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور اخیر دم تک اسی حالت میں رہے، جب مرزا نے دلّی میں سکونت اختیار کی، تو ان کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے ان کا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز کہ دونوں عمر رسیدہ تھے، ان کے پاس رہتے تھے۔ جب دلّی فتح ہو گئی اور شہر اہلِ دہلی سے خالی ہو گیا اور رستے بند ہو گئے، اس وقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے، سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے اور جو کچھ اسباب ملا، لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا، یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہ کر آج آدھی رات گزرے مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسّال اور گورکن کا کہیں پتا تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا، مگر مرزا کے ہمسایوں نے ان کی بڑی مدد کی۔ پٹیالے کی فوج کے ایک سپاہی کو جو حفاظت کے لیے تعینات تھا، اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لے کر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے، مسجد کے صحن میں، جو مکان کے قریب تھی، دفن کر دیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں:

دریغ آن کہ اندر درنگِ سہ بیست　　سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست

تہِ خاک بالیں ز خشتش نہ بود　　بجز خاک در سر نوشتش نہ بود
خدایا! بریں مردہ بخشایشے　　کہ نادیدہ در زیست آسایشے

سروشے بہ دلجوئیِ او فرست   روانش بجاوید مینو فرست

اور بھائی کے مرنے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے:

زسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف   کہ زیستے بہ جہاں در ز خویش بیگانہ
یکی در انجمن از من ہمی پژوہش کرد   کشیدم "آہے" و گفتم "دریغ دیوانہ"

اس میں لفظ "آہے" کا تخرجہ "دریغ دیوانہ" میں سے کیا ہے۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے؛ راجا کے سپاہیوں نے ہر چند روکا، مگر انھوں نے کچھ التفات نہیں کیا۔ مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا، مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل برون کے روبرو، جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے، لے گئے۔ کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہم کو رخصت کر دیا۔

لطیفہ سنا ہے کہ جب مرزا کرنل برون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہِ پاپاخ ان کے سر پر تھی۔ انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ "وِل، تم مسلمان؟" مرزا نے کہا: "آدھا۔" کرنیل نے کہا: "اس کا کیا مطلب؟" مرزا نے کہا: "شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔" کرنیل یہ سن کر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیرِ ہند کی چھٹی جو ملکۂ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی، دکھائی۔ کرنیل نے کہا: "تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟" مرزا نے کہا: "میں چار کہاروں کا افسر تھا؛ وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میں کیوں کر حاضر ہوتا؟" کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

اس مقام پر مرزا اپنی کتاب دستنبو میں لکھتے ہیں کہ "سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے۔ میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قیدِ کیش و ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھ کو نیند نہ آتی

تھی۔ اگر جواں مرد، خدادوست، خداشناس، دریادل **مہیش داس** ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ اور بو میں اس سے بہتر تھی، مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جاں بر نہ ہوتا۔" اس کے بعد یہ رباعی لکھی ہے:

رباعی

از دیر دلم دایہ زہر در می جُست　　از بادۂ ناب یک دو ساغر می جُست
فرزانہ **مہیش داس** بخشید بہ من　　آبے کہ برائے خود سکندر می جست

چونکہ اس وقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا، مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا، جو اُن کے پاس برابر آتے رہتے تھے، اور ہر طرح سے ان کی غمخواری کرتے تھے، کوئی ان کا غمخوار نہیں رہا تھا۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے: سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ۔ سو یہ دونوں ذریعے مسدود ہو گئے تھے شہر کے تمام مسلمان عمائد جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے، اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اس کے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا اور کوئی قیمتی چیز تھی، جب شہر لٹنے لگا، تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لیے بھیج دیا، جہاں سے فتح مند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی اور عُسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا اور جو حالت ان پر اور ان کے متعلقین پر خوش و ناخوش گزری، اس میں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے، وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار ناچار ان کی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھا گیا؛ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔ اس کے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ اس بازیچۂ اطفال یعنی کتابِ دستنبو کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کی جائے! جو حالت کہ اس وقت درپیش ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا انجام یا موت ہے۔ یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دکان سے

دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسہ کچھ مل گیا۔ پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اس میں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا، اور نہ ملی، تو کام ہی تمام ہے مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی، ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جاکر سرانجام کرنا پڑے گا۔

وظیفۂ رامپور

غدر کے بعد دو برسوں تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد نواب یوسف علی خان مرحوم رئیسِ رامپور نے سو روپے ماہوار ہمیشہ کے لیے مرزا کے واسطے مقرر کردیا، جو نواب کلب علی خان مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا، اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بَری ثابت ہوئے، سرکاری پنشن بھی جاری ہوگئی۔

لطیفہ

جب نواب یوسف علی خان کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لیے رامپور گئے، چند روز بعد نواب کلب علی خان مرحوم کا لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا: "خدا کے سپرد۔" مرزا نے کہا "حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"

قاطع برہان

جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا، اس وقت سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں۔ مرزا کے پاس اس وقت سوائے برہان قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ برہان کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا۔ شعراء نے جو الفاظ مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ہیں، ان کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔ طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصولِ لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سی لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابلِ اعتراض

نظر آئے، ان کو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی، **جس کا نام** **قاطع برہان** رکھا گیا اور ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہو گئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں باضافۂ دیگر مضامین و فوائد اس کو دوسری بار چھپوایا اور اس کا نام **درفشِ کاویانی** رکھا۔

یہاں دو چار مثالیں ان الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں، جن پر مرزا نے صاحبِ برہان کا تخطیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحبِ برہان نے **عنبرِ ارزاں** کے معنی گیسوے رسولِ مقبول کے لکھے ہیں اور پھر کہتا ہے کہ اس کو **عنبرِ لرزاں** بھی کہتے ہیں۔ مرزا صاحبِ برہان کی غلطی کا منشا یہ بتاتے ہیں کہ اس نے **نظامی** کا یہ شعر دیکھا ہے، جو نعت میں ہے:

بوئے کزاں عنبرِ لرزاں دہی گر بدو عالم دہی، ارزاں دہی

پس **عنبرِ لرزاں** میں استعارے کو اصلی لغت قرار دیا اور دوسرے مصرعے میں ارزاں کے موقع اور محل کو بالکل نہیں سمجھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زلفِ عنبر بُو، جو دونوں جہان کے بدلے میں بھی ارزاں ہو، اس کا نام عنبرِ ارزاں رکھ دیا۔ یا مثلاً بُرہان میں لکھا ہے: "**قافلہ شد** بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدنِ پیغمبر باشد۔" اول تو **قافلہ شد** کو ایک لغت قرار دینا بے معنی ہے۔ پھر اس کے معنی قافلہ سالار رفت کہنا، اور قافلہ سالار کے جانے سے وفاتِ سرورِ کائنات لینا غلط در غلط اور خبط در خبط ہے۔ مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اس شعر کو بتاتے ہیں۔

قافلہ شد واپسیِ ما ببیں اے کسِ ما! بےکسیِ ما ببیں

یہ شعر مخزنِ اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے۔ مگر مرزا نے سہو سے اس کو جامی کی طرف منسوب کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چل دیے، اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار و مددگار نہیں ہے۔ یا مثلاً صاحبِ برہان لکھتا ہے: "**ششش ضرب نتیجہ خوب**، کنایہ از گوہر درز باشد و کنایہ از مشک و کنایہ از شکر و عسل و اقسام میوہ باہم بست و بجذرِ ضرب ہم بنظر آمدہ کہ ششش نتیجہ خوب باشد۔" مرزا نے جو اس کا خاکہ اڑایا ہے، وہ طول طویل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مرکب اور بے معنی جملے کو لغت قرار دینا صاحبِ برہان ہی کا کام ہے اور اس

طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت کی ہے اور طرح طرح کی لغزشیں اور بے ربطیاں ہیں، جو بغیر اس کے کہ درفشِ کاویانی کو اوّل سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔

جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے، نہ اس وقت ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ انھوں نے لکھا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔ با ایں ہمہ چند مقامات کے سوا، جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے اور بعض غلطیوں کا انھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے۔ ان کے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ درفش کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلائے کلکتہ کی مصحّحہ و مطبوعہ برہان مرزا کے پیشِ نظر تھی۔

قاطع برہان کی مخالفت اور اس کی وجہ

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا۔ ایک قاطع برہان کے جواب میں "محرقِ قاطع"، "قاطع قاطع"، "مؤیدِ برہان"، "ساطعِ برہان" وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔ مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امورِ مذہبی میں، بلکہ ہر چیز، ہر کام، اور ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحیِ منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات بُرہان قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے، ممکن نہ تھا کہ ان کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہِ شوخیِ طبع کے صاحبِ برہان کا جا بجا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحبِ برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت

ضرور ہوتی کیوں کہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک نہایت کس مپرسی حالت میں ہیں، ان کے لیے کنجِ خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔

جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے، جب ان کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک مجیب برہان کی تائید اس طرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحبِ برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے، اسی طرح فرہنگِ جہانگیری یا فرہنگ رشیدی یا سراج اللغات یا مؤید الفضلا، یا ہفت قلزم یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے اور اس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اسی کا تتبع کیا ہے تو مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

قاطع برہان کی تائید

ایران کے ایک مشہور مصنف **رضا قلی خان** ہدایت نے ۱۲۸۸ھ میں یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، جو فرہنگِ ناصری کے نام سے موسوم ہے، اور مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغت کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ بہر حال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھ کر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں، زیادہ معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُس نے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگِ جہانگیری، فرہنگِ رشیدی اور برہانِ قاطع، تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اس کے بعد ایک باب میں صرف برہانِ قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے، ایک پہاڑ کے اوپر، یا غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا، یا چکاک کے تین معنی لکھے ہیں، پیشانی، قبالہ نویس اور مہر کن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافاتِ ہرات میں اس کو برہان میں لکھا ہے: "قریہ

ایست از قرائے عالم۔" یہاں ازراہِ طنز صاحبِ فرہنگِ ناصری لکھتا ہے: "فی الحقیقت تحقیقے دقیق فرمودہ است۔" اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحبِ برہان کی اس باب میں ظاہر کی ہیں اور اس کے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جابجا اس کا تخطیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کیے ہیں ان کی بھی جا بجا فرہنگ ناصری سے تائید ہوتی ہے۔ از انجملہ لفظ آبچیں۔ **استخر، اصطخر، جمدر، باختر، راوش، زاوش، کارکیا، ویژہ، ادیژہ**، اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگ ناصری میں مرزا کے بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل بتایا ہے، رضا قلی خان بھی اس کو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً لفظ انجلک کی تفسیر میں صاحبِ برہان لکھتا ہے: "ہر چند فراشِ خیال جاروب سنبل بر حل خرسک ریش زند از پوست، آں پاک نتواند۔" مرزا اس کی نسبت لکھتے ہیں: "فقرۂ آخر مگر کلام دیواست؟ ہر گاہ خوبیِ تحقیق چناں و حسنِ عبارت چنیں باشد، مقصودِ اصلی کہ معلوم کردنِ مجہولات است، از برہانِ قاطع چگونہ حاصل تواں کرد۔" رضا قلی خان ازراہ طنز اسی فقرے پر یہ لکھتا ہے: "دریں مقام ایں انشائے بدیع و بیانِ بلیغ زادۂ طبع ایشاں بودہ۔ برہانِ ذوقِ سلیم و سلیقۂ مستقیم صاحبِ برہان خود ہمیں عبارات بس است۔ تا ازیں سپس از و چہ آید۔" اسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کر کے اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "در ولایتِ ہند کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضبط و تصحیح لغاتِ فارسی کے توانند۔" ایک جگہ صاحبِ برہان جامع (جو کہ ایرانی ہے) کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ برہانِ قاطع میں لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کیے گئے ہیں، ان پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اس میں کنایات کو بھی علاحدہ لغت قرار دیتا ہے اور سریانی و عبرانی و ترکی و ژند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں، اور ایک ایک لغت کو بار بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں، تطویلِ لاطائل کرتا ہے۔" اس کے بعد رضا قلی خاں صاحبِ برہان جامع کی تصدیق اور اس کے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہے۔ چونکہ مرزا کی تالیف میں یہ بیان بے مزہ معلوم ہوگا اس لیے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ فرہنگ ناصری کو خود ملاحظہ کرے۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کیے ہیں۔ خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اس کو لفظ عربی الاصل ماخوذ از اسف قرار دیا ہے۔ اور اس غلطی کا انھوں نے آخرکار خود بھی اعتراف کیا ہے اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کے سوا اور بھی کہیں کہیں ان سے غلطی ہوئی ہو۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع بر کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتی اور ذوقِ صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور جیسا کہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر" فی الواقع فارسی زبان سے ان کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جو رائے کہ انھوں نے محض اپنے وجدانِ سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے محققوں نے اس کی نسبت ظاہر کی ہے، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں وہ اور ان کے سوا بے شمار غلطیاں صاحبِ فرہنگِ ناصری نے اس میں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتیِ طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

مرزا نے قاطع برہان کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں۔ ان میں سے فائدۂ اول کا ماحصل یہ ہے کہ ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خودنمائی کی بو آتی ہے اس لیے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر ہندوستانیوں کو مسلّم نہ جاننا اور خود زبان دانی کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران سے آیا تھا اور میرا باپ دلّی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہلِ زبان سمجھتا ہوں۔ میں بلا شبہہ زبان دان ہوں اور میری زباندانی اولاً خداداد سلامتیِ طبع کی بدولت ہے جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرتاً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے مولانا عبدالصمد کے فیضِ صحبت سے جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اس سے تربیت پائی اور باون برس مشقِ سخن کی۔ اب کہ مجھ کو چھیاسٹھواں سال ہے، میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے

میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا، اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے، اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ گویا نظیری جنت آرام گاہ کا **مقطع** میرے حسبِ حال ہے:

تو نظیری! ز فلک آمدہ بودی، چو مسیح   باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت، دریغ!

جتنے آدمیوں نے **قاطع برہان** کے جواب لکھے ہیں، ان میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں اور ان جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخیِ طبع سے کام لیا ہے۔ کہیں ان کے طرزِ بیان کا خاکہ اڑایا ہے، کہیں ان کی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے۔

لطیفہ مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیوں کہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا، حضرت! آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا: "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے، تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟"

ایک شخص مرزا احمد علی **بیگ** متوطن کلکتہ جنھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب **مؤید البرہان** لکھی ہے، جس کے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ **قاطع برہان** کے چند اوراق کی تردید کے لیے چھان مارا اور مثل اور مجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا اور جو سخت الفاظ مرزا نے صاحبِ برہان کی نسبت استعمال کیے تھے، ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کیے ہیں، اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تعریفیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں۔ اس کے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ وم بہ **تیغ تیز** لکھا ہے اور ایک فارسی قطعہ بھی ان کو لکھ کر بھیجا ہے جس کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں:

خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا، چہ سود!   خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است
با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند   لالہ و شوگیری و لطف و مدارا کردہ است
داوری گاہے بنا فرمودہ در وصفِ ہر سہ را   منصف و صدر امین و صدرِ اعلیٰ کردہ است
گرچنیں با ہندیاں دارد تولا در سخن   من ہم از ہندم، چرا از من تبرا کردہ است؟
مطلب از بدگفتنِ من چیست؟ گویا نیک مرد   مُزدِ ایں کار از حق آمرزش تمنا کردہ است
صاحبِ علم و ادب، وانگہ ز افراطِ غضب   چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است

در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد بلے!   ننگ دارد علم از کارے کہ آغا کردہ است
انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع می کشد   آنچہ ما کردیم باوے، خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام، گفتارِ من باید درشت   ولے بروے گر بتقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم، لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام   شوخیِ طبعے کہ دارم، ایں تقاضا کردہ است
می کند تا بہرِ برہان، لیک برہاں ناپدید   نیست جز تسلیمِ توش ہرچہ انشا کردہ است
سستیِ طرزِ خرامِ خامۂ برہان نگار   یا نمیدانست، یا دانستہ اخفا کردہ است
بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسیں جا بجا   ہم مرا، ہم خویش را در دہر رسوا کردہ است
یافتم از دیدنِ نارنجہاے آں کتاب   خود بدم گفت و باحبابِ خود ایما کردہ است
غازیاں ہمراہِ خویش آورد، از بہرِ جہاد   تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اس کے متعلق مرزا کی جس قدر تحریریں ہیں، ان میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و ظرافات بھی درج ہیں۔

لطیفہ لفظ فراز کو صاحبِ برہان اضداد میں گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونوں بتاتا ہے۔ مگر مرزا اس کو اضداد میں سے نہیں گنتے بلکہ اس کے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں اور جو اشعار مخالفوں نے سند میں پیش کیے ہیں، مرزا نے انھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے۔ مگر چوں کہ ہندوستان کے تمام فرہنگ نگاروں نے فراز کو اضداد میں شمار کیا ہے۔ اس کی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ "اس کو امرِ اجماعی قرار دینا ایسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اہلِ شام نے خلافتِ یزید پر اجماع کیا تھا"

لطیفہ صاحبِ برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اس کے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں: "خدا پرستان! از بہرِ خدا، ایں عربی نفہم، فارسی ندان (یعنی جامعِ برہان) نمی پرسم کہ کیست؟ می پرسم کہ چیست؟" ایک اور جگہ نہایت طیش کے عالم میں لکھتے ہیں: "چوں شناسائیِ حقیقتِ جوہرِ لفظ ندارد، فرہنگ چرا می نگارد؟ بوریا می بافت، رسن می تافت، ہیزم می فروخت، گلخن می افروخت۔"

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا اور جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا، ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی؛ مگر

جب کامیابی کی امید نہ رہی، تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثنائے تحقیقات میں دہلی کے بعض اہلِ قلم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع ان سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے، یا نہیں؟ انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنے بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔

ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا "حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟" مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

بہرچہ درنگری، جز بجنس مائل نیست
عیارِ بےکسیِ من شرافتِ نسبی است

گمنام خطوں میں گالیاں

جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا، ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب و شتم بھیجنے شروع کیے، جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی۔ اُن دنوں میں مرزا کی عجیب حالت تھی، نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے، اور جب چٹھی رسان ڈاک لے کر آتا تھا، تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اس قسم کا خط نہ آیا ہو، ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔

اتفاق سے انھیں دنوں میں نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہوا۔ چوں کہ مجھ کو ان نالایق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا، ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہم مذہبی خودپسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے اہلِ سنت کو، اور اہلِ سنت میں سے صرف حنفیہ کو، اور ان میں سے بھی صرف ان لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرۂ رحمتِ الٰہی کو کوئین وکٹوریہ کی وسعتِ سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں، زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔ جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا، اُسی قدر اِس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت

پر ہو، جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لیے ناگزیر ہے۔ چوں کہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لیے ہمیشہ ان کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضوان میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی، استادی، اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو نصیحت کرنی شروع کی۔ چوں کہ ان کا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور ان سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے سے کی جاتی تھی، نمازِ پنج گانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر، یا بیٹھ کر، یا ایما و اشارے سے، غرض جس طرح ہو سکے، نمازِ پنج گانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی، مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری، اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ انھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں ان کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھ کر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ انھوں نے کہا: "ساری عمر فسق و فجور میں گزری، نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی [illegible] ہو سکے گی۔ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں، میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں، اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کووں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے، لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں: لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ۔"

لطیفہ شاید اسی روز جب کہ یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے، چٹھی رسان نے ایک لفافہ آکر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے، جیسے پہلے آ چکے ہیں۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا: کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگردِ معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی، مسکرا کر کہنے لگے کہ "اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ عمر آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں، تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیوں کہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچّے کو ماں کی گالی دیتے ہیں، کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے، اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟"

اس کے بعد میں ان سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھ کر میرے پاس بھیجی، جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اُ [illegible] بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے، وہ یری ہی نسبت سے۔ غزل یہ ہے۔

بمقصدے کہ مراں را رہِ خدا گویند
بِرَو بِرَو کہ ازاں سُو بیا بیا گویند
کسے کہ پاے ندارد، چگونہ راہ رود
خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند؟
زرمزِ تخلِ انا اللہ گوے ناآگاہ
حدیثِ جلوہ گہ و موسیٰ و عصا گویند
مگر ز حق نہ بود شرم، حق پرستاں را
کہ نامِ حق نبرند و ہمیں انا گویند
ز قولِ شاں نہ بود دل نشینِ اہلِ نظر
جز آں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند

نخواندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا
بغیرِ بے مزہ وا گویہ ہا کہ وا گویند
دم از وجود؟ [illegible] دنئ زدند بیخبراں
چساں عطیۂ حق را گناہِ ما گویند
بلے! اگ [illegible] ہ بود دعویِ وجود از ما
با ہلِ راز چنیں گوی تا بجا گویند
ملامتیاں را چہ زہرۂ پاسخ
اگر بہ خشم گرایند و ناس [illegible] اگویند
عزرہ زرسِ خود را و بہر عرضِ فریب
بہ پیشِ خلق حکا [illegible] رکیمیا گویند

کساں کہ دعوئ نیکی ہمی کنند، مرا
اگر نہ نیک شمارند، بد چرا گویند؟
طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا
بس است ہمچو توئی را کہ پارسا گویند
بگوی مردہ کہ در دہر کارِ غالبِ زار
ازاں گزشت کہ درویش و بینوا گویند

اس غزل کو دیکھ کر مجھ کو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنونِ خاطر ہیں، اور کبھی ان کے اظہار کی نوبت بھی نہیں آئی، ان کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعے میں بیان کیا جائے، چنانچہ قطعۂ ذیل ترتیب دے کر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا:

قطعہ

تو اے کہ رونق پیشینیاں بہم بشکست
ز نظم و نثرِ تو کاندر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بقانونِ ذوقِ سنجیدی
چہ بذلہ ہا کہ باندازِ دلربا گفتی
رسید نشۂ عرفاں، چو ذکرِ مے راندی
شگفت خاطرِ یاراں، گر از صبا گفتی
دوید ریشہ بدلہا، چو حرفِ مہر زدی
دمید نخلِ تمنا، چو از وفا گفتی
گہر بہ بزم فشاندی، اگر ثنا خواندی
اثر ز لفظ دماندی، اگر دعا گفتی
ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی
ہزار نکتۂ پوشیدہ برملا گفتی
ز سرِ تفرقۂ جمع قصہ ہا راندی
ز سیرِ انفس و آفاق راز ہا گفتی
برآمد از دلِ بیگانگاں ترانۂ ذوق
بہ محفلے کہ سخنہائے آشنا گفتی
لطیفہا کہ بلفظ و بیاں نمی گنجید
تو چوں فرشتہ ز غیب آمدی و وا گفتی
بحقِ لطفِ کلامت کہ ہست بر دلِ ما
کہ پایۂ سخن افراشتند، تا گفتی
تو اے کہ ہر سخنِ نغزِ تو، بدل جا کرد
جز آں کہ در حقِ حالی بہ رمز وا گفتی
ہر آنچہ گفتہ اندر جوابِ عرضِ نیاز
خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی
ولے بعربدہ از حرفِ چند باخویشم
کہ گر نگفتہ ام، آخر تو از کجا گفتی
عجب کہ قاعدہ دانِ نیازمندی را
سفیہ و معجب و خودبین و خودنما گفتی
عجب کہ چاشنی اندوزِ خاکساری را
رہینِ ذوقِ نواسنجیِ انا گفتی
عجب کہ منفعلے را ز نقدِ ناسرہ اش
بہ زرق در گروِ عرضِ کیمیا گفتی
نہ راہِ حرفِ بسویت، نہ جاے من بدلت
جواب چیست، اگر پرسم، از کجا گفتی
اگر نہ روے سخن با تو بود، می گفتم
چگونہ گفتی و چوں گفتی و چرا گفتی؟

ولیک شرطِ ادب نیست، بر تو خردہ گرفت   ہر آنچہ در حقِ من گفتۂ، بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا، اس زمانے میں مجھ کو نواب محمد مصطفےٰ خان مرحوم متخلص بہ شیفتہ و حسرتی، رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور ان دنوں میں وہ دلّی آئے ہوئے تھے، اور میں انھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا، تو انھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھ کر بھیجا۔ جو ذیل میں درج ہے:

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری   ہمی بہ لطفِ تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید   تو گر شفیع نگردی، بگو، چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال   براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمرِ پیشینہ   دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھ کو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعے کا ذکر چھڑ گیا ہے اُس کو انجام تک پہنچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعے پر میں نے ایک اور قطعہ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے:

قطعہ

تو اے کہ عذرِ فرستادہ بسوے رہی   سزد کہ جانِ گرامی براں نثار کنم
شکایتے تو تواں گفت عینِ اخلاصش   گرم تو دوست شماری، ہزار بار کنم
نماند قاعدۂ شکرِ بے ریا بجہاں   اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جز بہ تقاضاے دوستی نبود   ز غیرِ شکر و شکایت ز دوستدار کنم
سرشتِ پاک و دلِ صاف دادہ اند مرا   بحرفِ تلخ دلِ حالی از غبار کنم
خوش آنکہ عذرِ تو چوں در کند مرا بزمیں   دگر بہ پیشِ تو تمہیدِ اعتذار کنم
براں سرم کہ اگر مرگ امان دہد زیں پس   ز کارہاے جہاں، خاصہ ایں سہ کار کنم

زکردہ توبہ نمایم زگفتہ استغفار دگر سپاسِ تو پنہان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا، اس پر یہ لکھ کر کہ "بس اب بیت بخشی موقوف" میرے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

عربی استعداد، فارسی دانی، عروض، نجوم، تصوف اور تاریخ

مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ استاد سے نہیں پڑھا تھا۔ مگر چونکہ علمِ لسان سے ان کو فطری مناسبت تھی، ان کی نظم و نثر اردو فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہو گا۔ عربی الفاظ کو انھوں نے ہر جگہ اسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔

شاعری، جس کا ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا، اُس سے قطعِ نظر کر کے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہلِ زبان کے اسالیبِ بیان پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہلِ زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہو گا۔

اس کے سوا فنِ عروض میں بھی ان کی کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سُنا گیا ہے کہ باوجود کمالِ شاعری کے اس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جن کے وزن اور تول کا اندازہ صرف استقامتِ طبع سے ہو سکتا ہے، اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں

من ندانم فاعلاتن فاعلات شعر می گویم بہ از قند و نبات

مرزا کا ایسا حال نہ تھا۔ چنانچہ فارسی اردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ

ایسی ٹیڑھی بحروں میں انھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیتِ عروض کے ان بحروں میں نہیں چل سکتے۔

علمِ نجوم سے کسی قدر اور اس کی اصطلاحات سے پوری واقفیت ان کو تھی چنانچہ ان کی فارسی نظم میں جا بجا اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

علمِ تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب ست" ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔

فنِ تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے ان کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ، یعنی مہر نیمروز لکھ رہے ہیں، کسی نے ان کو مورّخ سمجھ کر کچھ سوالات کیے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں "میں فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کار پردازانِ دفتر شاہی خلاصۂ حالات از روئے کتب اُردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں، میں اس کو فارسی کر کے حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں، میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، مورّخ نہیں ہوں

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

خط، شعر خوانی مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز، نہایت شیریں اور دل آویز تھا جیسا کہ اکثر اہلِ ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوش خطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔

شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص کر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے، جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا، صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سُنا ہے۔ چوں کہ ان کے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی، اس لیے صبح ہو گئی تھی۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدر داں نہیں پاتے اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنونؔ، شاہ صاحب کے پُرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے، ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ "دریا گریستن"

اور "تنہا گریستن"، جو جناب امام حسینؑ کی منقبت میں انھوں نے لکھا" پڑھا۔ سنا ہے کہ مجلسِ مشاعرہ بزمِ عزا بن گئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ مفتی صدر الدین خاں مرحوم بھی موجود تھے۔ اتفاق سے اسی حالت میں مینہ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے کہا: "آسمان ہم گریست"۔

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندرگاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلسِ عزا تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ بانیِ مجلس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اس وقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی، اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے؛ میں نے وہی پڑھ دیے۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی۔ عرب، عجم اور ہندی، سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھ سے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے؟ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے تھے:

مزدِ شفاعت و صلہ، صبر و خونبہا
ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اسی شعر پر مصرعے لگائے تھے مگر ان کو خود پسند نہ آئے اور یہ کہا کہ جس رتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

وسعتِ اخلاق مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے، جو ان سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا، وہ اپنے ذمّے فرضِ عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں

کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے، اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے، مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ انھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے۔ اس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا بر زبانِ قلم رفت؟ ہنجارِ نوازشِ نیازمندانِ بے نوا نہ اینست۔ بے سرمایہ ام، نہ فرومایہ؛ سخنورم، نہ سوداگر؛ موئینہ پوشم، نہ کتاب فروش؛ پذیرندۂ عطایم، نہ گیرندۂ بہا۔ ہر چہ آزادگان بشہزادگان فرستند، نذرست؛ ہر چہ شاہزادگان بہ آزادگان بخشند، تبرک۔ بیع و شرا نیست، چون و چرا نیست۔ ہر چہ فرستادہ ام، ارمغانست و ہر چہ خواہم فرستاد، ارمغان خواہد بود۔"

مروت

مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودے کہ اخیر عمر میں وہ شعر کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں: "جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبرِ سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمتِ اصلاحِ اشعار سے مجھے معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا، لکھ دیا کروں گا۔" باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوقِ سخن کے اصلاحِ اشعار منظور فرمائی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "لاحول ولاقوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوقِ شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریقِ قہرِ درویش بجانِ درویش لکھا تھا جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

فراخ حوصلگی اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی، اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت، مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی، تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہوگئی تھی، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم دیتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیجیے۔ انھوں نے کہا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے، تو یہی حاضر ہے۔" مرزا نے کہا: "جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت، آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر جاڑا شدّت سے پڑ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟" پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے، نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور حالاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی، اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے، مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی، ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی "بادِ مخالف" لکھی تھی، ان کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ با سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علٰحدہ بھیجی تھیں؛ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہانِ قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ محض اپنی یادداشت کے بھ ے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے ا، جب کوئی شع انجام ہو جاتا تھا، تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ ایک سرسری نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب

مصطفیٰ خان مرحوم "گلشنِ بیخار" میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں: مضامینِ شعری را کما ہو حقہٗ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے می برد، و ایں فضیلتے است کہ مخصوصِ خواصِ اہلِ سخن است اگر طبعِ سخن شناس داری، بایں نکتہ می رسی؛ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است، اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حالِ کسیکہ از ہر دو شربے یافتہ، و حظے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج، نغز گفتار کمتر مرئی شدہ"۔ نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا، جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں" "حور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر ان سے کہا کہ "اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

عشق عصیانست اگر مستور نیست　　کشتۂ جرمِ زبان مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں ہماری غزل ہے، اُردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا:

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں　　کشتۂ جرمِ زبان ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کونسا مطلع اچھا ہے"۔ چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمے سے بہت پست ہو گیا تھا، سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے، اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلعے ہیں، ان میں آپ محاکمہ کیجیے کہ کون سا مطلع اچھا ہے؟ اور بطور بیٹھن کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سن کر سر دھننے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا۔ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اٹھے۔

کتاب فہمی

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

حسنِ بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا: "مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا: "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔"

لطیفہ

ایک دن نواب مصطفیٰ خان کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے، تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھا: "کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکیست"۔ جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرعہ پڑھا: "ایں خانہ تمام آفتاب ست"۔

لطیفہ

ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا: "میں تو تم کو میری سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے، وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی، جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُس وقت مرزا صاحب اُسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا، "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

خودداری

باوجودے کہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری و حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائدِ شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے، وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے؛ اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا، وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک دف کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے مکان پر آئے، میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا؛ نواب صاحب نے کہا: "آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں، یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟" مرزا نے کہا "مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا۔ اس لیے اوّل وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"

لطیفہ

ایک دن دیوان فضل اللہ خان مرحوم چُرٹ میں سوار، مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا۔ مضمون یہ ہے کہ: "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائق ہو سکتی ہے کہ آپ

کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔" جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا، وہ نہایت شرمندہ ہوئے، اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

خوراک مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے؛ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا۔ اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر میں سے آتا تھا، اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا، ایک پیالی میں بوٹیاں، دوسری میں لعاب یا شوربہ۔ ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی۔ ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی؛ اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب۔ بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

لطیفہ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے، تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے، اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے، تو بایزید کا۔"

آموں کی رغبت فواکہ میں آم ان کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دور دور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کر کے آم منگواتے تھے۔

حسنِ طلب ان کے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے میں انھوں نے امام باڑہ ہگلی بندر کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں: "لختی شکم بندہ ام و قدرے ناتواں، ہم آرایشِ خوان جوئیم، و ہم آسایشِ جان، خردوراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر ست، و اہلِ کلکتہ برآنند کہ قلمرو انبہ ہگلی بندست۔ آرے انبہ از ہگلی، و گل از گلشن، ایثار از جناب و سپاس از من۔ شوق می سگالد کہ تا پایانِ موسم دو سہ بار بخاطرِ ولی نعمت خواہم گذشت۔ وآز می نالد کہ حاشا، بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت۔"

لطیفہ ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں، چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے، باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسّر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا: "مرزا، اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟" مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: "پیرو مرشد! یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے،

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں — کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا یا میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔" بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

لطیفہ حکیم رضی الدین خان، جو مرزا کے نہایت دوست تھے، ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا: "دیکھیے، آم ایسی چیز ہے، جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" مرزا نے کہا: "بے شک، گدھا نہیں کھاتا۔"

لطیفہ مرزا کی ہمت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خان مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے، تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا صاحب نے کہا: "بھئی، میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں: میٹھا ہو اور بہت ہو۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤنوش مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں، اُس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو، تو ہرگز

میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا، ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اوّل تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے، جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کافر نشے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا، جس کی شکایت سے ان کے تمام اُردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

لطیفہ مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست، جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے، اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا: "بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟" انھوں نے نہ مانا اور کہا: "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دے دیجیے گا۔" مرزا نے کہا: "ہاں، اس کا مضائقہ نہیں۔" جب وہ پیر داب چکے، انھوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا: "بھیا، کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمھارے پیسے دابے؛ حساب برابر ہوا۔"

لطیفہ ایک دن قبل غروبِ آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا: "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔" پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبدالاحد خان کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے، مگر خاص ان کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز ان کے لیے مزعفر پکا تھا، وہی ان کے سامنے لگا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا

ہوا تھا، جو اس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور، اور رکابی کیا کیجیے گا، اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔" نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اُس کی طرف سرکا دی۔

لطیفہ ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے: "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے، اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو، کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں! نہ تناسب ہے، نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

لطیفہ ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے۔ تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے، تاکہ وہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا: "قبلہ و کعبہ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔" مرزا نے کہا: "میں آپ کا جوتا کھانے کو شمعدان نہیں لایا، بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے انھوں نے شراب کی جا بجا تعریف کی ہے، مگر اعتقاداً وہ اس کو بہت بُرا جانتے تھے، اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے۔ باوجود اس کے انھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔

شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شرابخوار کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا: "بھائی! جس کو شراب میسر ہے، اُس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے۔"

لطیفہ ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں،

بے مے نکند در کفِ من خامہ روائی سر دست ہوا، آتشِ بے دود کجائی

میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی

ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔

ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب، ہائے غضب۔

یہ خط غدر کے بعد اس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت و تنگ دستی کے کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں۔

لطیفہ میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لیے کیا گیا تھا، اس کا ذکر لکھا ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شمارا خواندند و بذوقِ شربت ہفت صد من نبات بر دور آب در دہن گشت۔ سخن از بادۂ ناب نبود ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے۔

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ یا عمر خیام سے کم نہ ہوں گے۔ یہاں ایک شعر اردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے:

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں   یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند   جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

رباعی

غالب بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست   از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت خواہی و انگہ بسیار!   ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

اسلام کا یقین مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحیدِ وجودی کو اسلام کا اصلِ اصول اور رکنِ رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئاً اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ توحیدِ وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے، غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق

میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے:

امید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را — بدوستیِ سخنہاے آشنا بخشند

انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں، ایک توحیدِ وجودی اور دوسرے نبیؐ اور اہلبیتِ نبیؐ کی محبت؛ اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اس کے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا، مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکماے اسلام نے نعیمِ جسمانی سے انکار کیا ہے، مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

گردیدنِ زاہداں بہ جنت گستاخ — ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی، ز روے تشبیہ — مانندۂ بہائم و علف زارِ فراخ

مرزا باوجودے کہ احکامِ ظاہری کے بہت کم پابند تھے، لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔ مگر چوں کہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی، جب کوئی گرم نقرہ سوجھ جاتا تھا، پھر ان سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا، خواہ اس میں ان کو کوئی کافر سمجھے، یا رندِ مشرب کہے، یا بد مذہب جانے۔

لطیفہ غدر کے بعد جب کہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی، پنڈت موتی لال، میر منشی لفٹنٹی پنجاب، مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا: "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔"

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلحِ کُل تھا، مگر زیادہ تر ان کا میلانِ طبع تشیع کی

طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسولِ خدا صلعم کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔ ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں، جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھ کو یاد رہ گئی ہے، جو یہاں لکھی جاتی ہے:

رباعی

شوخیِ بیان

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری؟

دہریت اور تصوف میں جو بونِ بعید ہے، وہ ظاہر ہے۔ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود مانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ پس صوفی دہری کیوں کر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرعے کا یہ مطلب ہے کہ ماوراءالنہری یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں۔ یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراءالنہر سے تھی، اس لیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراءالنہری رافضی یا شیعی کیوں کر ہو سکتا ہے؟ جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاح اور طرزِ کلام سے ناآشنا ہیں، وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیے اپنا مذہب غلط بیان کیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کے خوش کرنے اور اہلِ دربار کے ہنسانے کے لیے لکھی گئی تھیں کیوں کہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا:

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

لطیفہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک سنّی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا

وقت تھا۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا: "کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟" مرزا نے کہا: "سُنّی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔"

بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر بادشاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا، مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے، عَلَم چڑھاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے عَلَم چڑھایا جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے عَلَم چڑھوایا گیا۔

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا، اور جس میں بادشاہ کو تشیّع کے اتہام سے بَری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتلائے تھے، ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی، تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے

اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔

سلامتیِ طبع

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودے کہ تیزیِ ذہن اور سلامتیِ طبع دونوں ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں، مرزا میں یہ دونوں باتیں بوجہِ اتم موجود تھیں۔ اسی سلامتیِ طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشقِ سخن میں جو ٹیڑھا رستہ انھوں نے اختیار کیا تھا، بغیر اس کے کہ کوئی استاد رہبری کرے، جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی، اسی قدر آہستہ آہستہ اس سے انحراف ہوتا گیا اور آخرکار اساتذۂ مسلم الثبوت کی روشِ مستقیم پر آرہے۔

مرزا ازراہِ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی، جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں، افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ جو زور ان کی تشبیبوں میں پایا جاتا ہے، وہ مدح میں آکر باقی نہیں رہتا مگر ہم اس کو ان کے نقصِ شاعری پر محمول نہیں کرتے، بلکہ غایت درجے کی سلامتِ ذہن اور استقامتِ طبع کی دلیل جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کا چمکانا، زمین آسمان کے قلابے ملانا اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اٹھانا فی الحقیقت شاعر کا کمال نہیں ہے، بلکہ جس قدر اس کی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے، اسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری کیوں کہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔ مگر فی الحقیقت جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، ان کو خوشامد کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہیے، ویسا نہیں آتا تھا۔

مسئلۂ امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین

اس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں جس سے مرزا کی سلامتیِ طبع کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولانا فضل حق مرحوم، مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور ان کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے۔ چوں کہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی انھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمایش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو، جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی

تردید اور خاص کر امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرو۔ اس مسئلے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے یعنی آں حضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے، جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

مرزا صاحب پر یہ فرمایش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو رائے مولانا فضل حق کی ہے، وہ فارسی نظم میں بیان کی جائے۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائلِ علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے، مگر انھوں نے نہ مانا۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی، جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے، لکھ کر مولانا کو سنائی۔ انھوں نے بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھاری برابر مشّاق ہوتا، تو بھی ایسی خوبی سے ان مطالب کو نہ ادا کرتا۔ مگر جو کچھ مرزا نے مسئلہ نظیرِ خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ مرزا نے صاف صاف تو نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے، مگر اس مضمون کو اس پیرایے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کر دے اور اس میں خاتم النّبیین کا مثل، جو اس دوسرے عالم کا خاتم النّبیین ہو، خلق فرمائے۔ چنانچہ انھوں نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است   قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے   ہم بود، ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود   رحمۃٌ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر؟   یا بیک عالم، دو خاتم خوب تر؟
در یکے عالم دو خاتم نامجوے   صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

جب مرزا اوّل بار مثنوی لکھ کر مولانا کے پاس لائے، تو مضمونِ مذکور اس اخیر شعر پر ختم کر کے لائے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ "یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اگر لاکھ عالم بھی خدا پیدا کرے، تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو، اور جس طرح میں کہتا ہوں، اُس طرح بیان کرو۔" مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصوصیت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی مقصود تھی۔ انھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے، اس کو تو اُسی طرح رہنے دیا، مگر اُس کے آگے چند اشعار اور اضافہ کر کے کلام کو اس طرح مربوط کر دیا:

غالب! ایں اندیشہ نپذیرم ہمی　　خُردہ ہم برخویش می گیرم ہمی
اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ　　دانم از روئے یقینش خواندۂ
ایں الف لامے کہ استغراق راست　　حکمِ ناطق معنیِ اطلاق راست
منشاءِ ایجادِ ہر عالم یکیست　　گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

اس کے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے، اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر جن میں نظیرِ خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کر دیا ہے:

منفردِ اندر کمالِ ذاتی است　　لاجرم مثلش محالِ ذاتی است
زیں عقیدت برنگردم، والسّلام!　　نامرادی نوردم، والسّلام!

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی، اور اعوجاج سے کس قدر ان کا ذہن ابا کرتا تھا۔ باوجودے کہ مولانا فضل حق نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ ان کی رائے تھی، مرزا کے خوب ذہن نشین کر دی تھی اور مرزا اسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے، مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آ کر سیدھی ہو جاتی ہے، اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اس کے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو، جو ٹھیک بات تھی وہ ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔

پھر اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے، وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے، اس کو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔

دادِ سخن

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اس کے ہر شعر پر خواہ اچھا ہو خواہ برا، برابر تحسین و آفرین کی جاتی ہے اور اچھے برے شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی، مرزا کی عادت بالکل اس کے برخلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو، جب تک اس کا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا، وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے تھے۔ اخیر عمر میں تو ان کا ثقلِ سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر پہلے ایسا حال نہ تھا، وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سن لیتے تھے! مگر جب تک کوئی شعر ان کے دل میں نہ چبھتا تھا، ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ ان کے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے اور اسی لیے ان کی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودے کہ ان کی طبیعت بہت صلح جُو واقع ہوئی تھی، شعر کی داد دینے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا اس کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے، بلکہ ذوقِ سخن ان کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق، جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی، ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے، منشی غلام علی خاں نے اُن کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے

خاں مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا: بھیا! تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا: کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا: ذوق کا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے! مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں، وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا: "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔" اس شعر کو بھی انھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار   لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خان داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے:

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں   "اُدھر جاتا ہے، دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے"

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اُن کی تعریف میں، شاید ان کا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے انھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھ کر اُس کی بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ "اگر اب میں رشک کرنے کے قابل ہوتا، تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد۔"

تقریظ لکھنے کا ڈھنگ

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمایشیں ہوتی تھیں اور جیسا کہ ظاہر ہے، تعریف کی مستحق فی الحقیقت بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح کُو اور مرنج و مرنجان واقع ہوئی تھی۔ وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے، مگر تقریظ نگاری کا انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو اور صاحبِ کتاب خوش بھی ہو جائے۔ بہت سا حصہ تمہید میں یا مصنف کی ذات اور اس کے اخلاق، یا اُس کی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل نہ ہوں، ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جُملے، جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے، لکھ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپ نے ستایش میں مضائقہ کیا ہے۔

تقریظِ دیوانِ تفتہ

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ، جو کلیاتِ نثرِ غالب میں ہے، لکھ کر بھیجی، تو انھوں نے بھی [illegible] شکایت کی تھی۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روشِ ہندوستانی فارسی

لکھنے والوں کی سمجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دوں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خان کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے! مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ، انطباعِ دیوانِ حافظ کی، جان یاکوب بہادر کی فرمایش سے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے، اور باقی نثر میں اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا، تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو پہچانتے، تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر، تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھئی میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔"

تقریظ تصحیح آئینِ اکبری

سرسید احمد خان نے جب نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے آئینِ اکبری کی تصحیح کی، تو دلی کے مشاہیر نے اس پر نثر میں تقریظیں لکھیں تھیں، اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی، جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودے کہ مرزا کو سرسید کی خاطر بہت عزیز تھی اور وہ اُن سے اور ان کے خاندان سے مثل یگانوں کے ملتے تھے، مگر چوں کہ مرزا ابوالفضل کی طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو آئین اس کتاب میں لکھے ہیں، ان کو اس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و پوچ سمجھتے تھے، اور تاریخ کا مذاق، جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا ہے، بالکل نہ رکھتے تھے، اس لیے آئینِ اکبری کی تصحیح کو انھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو ان کی یہ رائے غلط ہو یا صحیح، مگر جو کچھ آئینِ اکبری اور اس کی تصحیح کی نسبت ان کا خیال تھا، اس کو تقریظ میں ظاہر کیے بغیر نہیں رہے

چنانچہ اس مثنوی کے اوّل کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

مژدۂ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب   یافت از اقبالِ سیّد فتح باب
دیدۂ بینا آمد و بازو قوی   کہنگی پوشید تشریفِ نوی
ویں کہ در تصحیحِ آئیں رائے اوست   ننگ و عارِ ہمت والائے اوست
دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد   خود مبارک بندہ آزاد کرد!
گوہرش را آنکہ نتواند ستود   ہم بدیں کارش ہمی داند ستود
ہر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود   آں ستاید کش ریا آئیں بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم   در وفا اندازہ دانِ خود منم
گر بدیں کارش نگویم آفریں   جائے آں دارد کہ جویم آفریں

اس کے بعد انگریزوں کے آئین و قانون و ایجادات کسی قدر بیان کیے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ ان چیزوں کے سامنے پچھلے آئین سب تقویمِ پارینہ ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

طرزِ تحریرش اگر گویی خوش ست   نے فزوں از ہر چہ می جویی خوش ست
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است   گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

سیدا فیاض را شمر بخیل   نوز می ریزد رطب ہا زاں نخیل
مردہ پروردن مبارک کار نیست   خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست
غالب آئینِ خموشی دلکش ست   گرچہ خوش گفتی، نہ گفتن ہم خوش ست
در جہاں سیّد پرستی دینِ تست   از ثنا بگذر، دعا آئینِ تست
ایں سراپا فرّہ و فرہنگ را   سیّد احمد خانِ عارف جنگ را
ہر چہ خواہد از خدا، موجود باد!   پیشِ کارش طالعِ مسعود باد!

چونکہ اس تقریظ میں آئینِ اکبری کی تنقیص کی گئی تھی اور سرسیّد نے جو ایک نہایت مفید کام کیا تھا، اس کی کچھ داد نہیں دی گئی تھی، بلکہ اس کو غیر مفید ظاہر کیا گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے آئینِ اکبری کے آخر میں مرزا کی تقریظ کو نہیں چھپوایا۔

محققانہ نظر

مرزا کی دراکی [illegible] فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودے کہ ایسی سوسائٹی میں [illegible] ہوئے تھے، جس میں سلف کی تقلید

سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے؛ اندھادھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعِ برہانِ قاطع کی شہرت اور ناموری ان کو اس کا تخطیہ کرنے سے مانع نہیں ہوئی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> یزداں دلِ دانا و چشمِ بینا بہر آں دادہ است کہ کارِ دانش و بینش ازیں ہر دو گوہر برگیریم · و ہرچہ بنگریم · جز بہ ستودنِ دانش آں را نہ پذیریم استادی و شاگردی · پیری و مریدی نیست کہ تنہا اعتقاد بس باشد و بدیں کلامِ مشہور کہ "پیرِ من خس است و اعتقادِ من بس است" از بازپرس ایمنی رُوے دہد۔

حال آنکہ وہ ایران کے نامور شعرا کا نہایت ادب کرتے تھے اور ان کا ذکر ہمیشہ تعظیم اور احترام کے ساتھ کرتے تھے، پھر بھی اندھوں کی طرح ان کی تقلید نہ کرتے تھے۔ جو امور سماع اور نقل سے علاقہ رکھتے تھے، اُن میں اُن کے کلام کو بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے، مگر جو باتیں عقل اور درایت سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں ان کی تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ ایک خط میں حزیں کا، جس کو وہ بہت بڑا استاد جانتے تھے، یہ مطلع نقل کرتے ہیں:

ز ترکتازیِ آں نازنیں سوار ہنوز   ز سینہ می دمد انگشتِ زینہار ہنوز

پھر لکھتے ہیں کہ:

> اس مطلع میں ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے، تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلطِ محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا، حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

ایک خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں:

> یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے وہ حق ہے، کیا اس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے!

حق پسندی

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تصرف ان کے شعر میں کرتا تھا، اُس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔ مثنوی دردوداغ میں ان کا ایک مصرع تھا: "خوک شد و پنجہ زدن ساز

کردہ" جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۂ ناطق مکرانی کو بھیجی تو اس نے مرزا کو لکھا: "خوک سُم دارد، نہ پنجہ۔ اگر نزدیکِ اساتذہ اطلاقِ سم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود۔"

مرزا نے اس کے جواب میں صاف لکھ بھیجا کہ "اگر کلیاتِ فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا اور اس مصرعے کو یوں بنا دیتا "خوک شد و بد نفسی ساز کردہ" چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا، تو انھوں نے یہ مصرع اسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے:

ہمچناں در تتقِ غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندانند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سُنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبعِ ثانی میں انھوں نے نمود کی جگہ ثبوت بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے: "عید اضحیٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد"، مرزا نے اوّل "عیدِ قرباں" لکھا تھا۔ پھر نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے کہنے سے عید اضحیٰ بنا دیا گیا۔ حال آنکہ نواب موصوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن خان مرحوم کے بعد ہمیشہ انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں، بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت، اور وہ ملکہ جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی، ان کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

راست گفتاری

حال آنکہ ایشیائی شاعری جس کی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے، مرزا کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی، باوجود اس کے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لیے جو شخص ان کے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس

سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خان مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خان سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اس کو دیکھ کر واپس بھیج دوں گا۔ انھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے۔ ان کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

> "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا! اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے، تم کیا غضب ڈھاتے! میرا کلام، خرید آٹھ دس روپے کی، سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا، مجھ کو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے، مجھ کو مستعار دو، میں اس کو دیکھ لوں، جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں۔ یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ واللہ باللہ میں اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیج دوں گا؛ اگر تم کو واپس نہ دوں، تو مجھ پر لعنت! اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حاملِ رقعہ کو نہ دو، تو تم کو آفریں!

اسی طرح ایک خط میں نواب علاوالدین خان کو لکھتے ہیں..

بدست مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست

> مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا سودہ میں نے نہیں رکھا؛ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں، کونسی رباعیات مانگتے ہو؛ پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی! قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اوستا کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں ؎

بہ ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

مرزا کی اسی راست بازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے؛ جو دل میں تھا، وہی زبان پر تھا؛ جو خلوت میں کرتے تھے، وہی جلوت میں کرتے تھے پس اگر ان میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جس کو ہر کس و ناکس جانتا تھا، مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے۔

ناقدردانی کی شکایت

وہ اس خیال سے کہ ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے، اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی انھوں نے فارسی اور اُردو نظم میں جابجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفیٰ خان کے مکان پر آئے، اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری بڑی قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو"۔ اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدردانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ مہرِ نیمروز میں اس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمالِ شاعری محض ناقدردانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا، وہ ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں: "سینۂ من نَفَسی داشت بہ روان آسائی نسیمے کہ از گستنِ زر و زد، زیاں زدہ من کردم جُز بنابالیست نزدم۔ بنانِ مرا قلمی بود بہ دِجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد، بیہدہ کوشش من کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم"۔ یہی وجہ تھی کہ جب حسنِ اتفاق سے ان کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

منشی نبی بخش حقیرؔ تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے، کہیں وہ دلّی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد کا درمان اپنے ساتھ لایا، اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی، جس کی روشنی میں مَیں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے! حال آنکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا، یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؛ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں! مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصّے کیے، آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصّے کیے گئے ہوں اور آدھا

منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو، میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں، اور اس نعمت پر دنیا سے قانع ہے۔"

اپنے عجز کا اقرار مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمایش کی جاتی تھی، جو ان سے بآسانی سر انجام نہ ہو سکتی تھی، تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئے گا، بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا ان کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے، اور ان کے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے، ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چوں کہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا وہ فرمایش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حدِ کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا، مشکل سے مسدّس کے تین بند لکھے، جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے:

ہاں اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم! کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیے اور صاف لکھ بھیجا کہ "یہ تین بند صرف امتثالِ امر کے لیے لکھے ہیں، ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔" ان کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے، نہ آئندہ ہوگا۔

لطیفہ بعض اوقات ایسی فرمایشوں سے جن کے سر انجام کرنے میں ان کو دقت اٹھانی پڑتی تھی، بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادۂ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایک بار نواب علاء الدین خاں مرحوم

نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اس کے تاریخی نام کی فرمایش کی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> "شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے، جب جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسنِ طبعِ خداداد رکھتے ہو، ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیرِ غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خان، تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب، دہائی خدا کی! میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔

ہجو نہ لکھنا

باوجودے کہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح و ستایش کا صلہ ان کو کچھ نہیں ملا، اور جو محنت و کاوش ان کو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی وہ سب رایگاں گئی، مگر انھوں نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا۔ صرف ایک قطعہ جو مرزا کے مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہے، ہم کو ان کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے، جو میرے دوست اور مرزا کے عزیز شاگرد بہاری لال مشتاق دہلوی نے اس کتاب کے لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں۔ اس قطعے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے اور اس کا جواب مدتِ دراز تک مرزا کو نہیں ملا۔ تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے، جس کو مشکل سے ہجوِ ملیح کہا جا سکتا ہے۔ چوں کہ اس قطعے کا مضمون لطف سے خالی نہیں، ہم اول اس کا خلاصہ اردو زبان میں لکھتے ہیں، اس کے بعد قطعہ بجنسہٖ نقل کیا جائے گا۔

قطعے کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ

نواب کی خدمت میں بھیجا تھا، اور اس کے ساتھ عرضداشت بھی گزرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ کیا نواب مجھ سے آزردہ ہوگیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھ دیا ہوگا جس پر نواب کو آزردگی ہوئی عقل نے کہا، تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے، وہ جلدی فراہم نہیں ہو سکتا۔ اس نے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سانڈنی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت — یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جب کہ یہ ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے، تو اس کو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھ کو یہ دم دیا، تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لیے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کے لیے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیمان سے، جام جمشید عالمِ غیب سے، آبِ حیوان چشمۂ خضر سے، عمرِ ابد، نشاطِ جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں!

قطعہ

گفتم بخرد بخلوتِ اُنس   کاے شمع و چراغِ ہفت ایواں!
آیا زچہ رُو بود کہ نواب   ننوشت جوابِ نامہ ام، ہاں!
آں گونہ عریضہ کہ دانی   درویش نوشتہ سوے سُلطاں
آں گونہ قصیدہ کہ گوئی   از صفحہ دمیدہ سنبلستاں

ایں ہر دو رسید و نیست پیدا   زاں سُو اثرے بہ ہیچ عنواں
رنجید مگر ز مدح نواب   اے کاش نہ گشتمے ثنا خواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم   از گفتۂ خویشتن پشیماں!
عقلم بجواب گفت: "غالب!   زنہار مخور فریبِ شیطاں
نواب بہ فکرِ ارمغان ست   تا نامہ فرستدت بساماں

وآنہا کہ بخاطرش گزشتہ است   زود آں جمع جمع کرد تواں
زود است کہ جمع نیز گردد   دیر است کہ دادہ است فرماں
تا راہروانِ بحر و بر گرد   آرند بکوششِ فراواں
دیبا ز دمشق و مخمل از روم   الماس ز معدن و زر از کاں
فیل از دکن و زرد از کوہ   توسن ز عراق و دُر ز عماں
فیروزۂ نغز از نشاپور   یاقوتِ گزیدہ از بدخشاں
جمازۂ تیز رَو ز بغداد   شمشیرِ بُرندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر   زربفتِ گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں رُوست   بر رنج و ملال نیست بُرہاں“
چوں پیرِ خرد بدلفریبی   گفت ایں ہمہ رازہای پنہاں
گشتم بدرم امیدواری   مرہم بنہ زخم یاس و حرماں
گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد   آں قبلہ و قبلہ گاہِ اعیاں
ناچار ز راہِ حق گزاری   تا کردہ شود تلافیِ آں
من نیز طلب کنم برایش   ایں خواہش اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر   انگشتر و تخت از سلیماں
از عالمِ غیب جامِ جمشید   از چشمۂ خضر آبِ حیواں

عمرِ ابد و نشاطِ جاوید   نیروے دل و ثباتِ ایماں
توفیقِ جوابِ نامۂ خویش   توقیعِ عطا و بذل و احساں

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی، جو الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی تھیں۔ وہ نہایت متقی، پرہیزگار اور روزے، نماز کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے، اسی قدر ان کی بی بی احکامِ مذہبی کی پابند تھیں، یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ ہوتے تھے۔ بایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے، مگر ان کے کھانے پینے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی، ہمیشہ وقتِ معین پر وہ ایک بار

گھر میں ضرور جاتے تھے۔ اور بی بی اور ان کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی جان سے بڑھ کر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں، جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

لطیفہ کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں، اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے۔ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں؛ "امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے۔ نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی! تیرے بچوں کو میں پال لوں گا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے!" وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جداً یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

لطیفہ جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرہ سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا: "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟"

لطیفہ ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے، اس کا دیوان خانہ تو پسند آ گیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آ کر اُس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا: اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا: "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟" یہاں مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے:

قطعہ

گبر کہ در روزِ حشر جوں تو بیفتی　　بر سرِ دوزخ نہند تبرہ نہنبن
تا نہ نباشد دراں مضیقِ مصیبت　　در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن

لیک نباشد دراں مقامِ صعوبت　　شورِ تقاضاے ناروائے مہاجن

رُباعی

اے آنکہ براہِ کعبہ رُوے داری　　دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
زینگونہ کہ تندمی خرامی، دانم　　درخانہ زنِ ستیزہ خوے داری

لطیفہ مرزا اپنی شوخ طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خان معروف، جن کے تقدس اور بزرگی کے سبب ان کے بڑے بھائی زانوے ادب تہ کرکے ان کے سامنے بیٹھتے تھے، اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب ان کے قبلہ و کعبہ تھے، ان کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ لوگوں کو مُرید بھی کرتے تھے، اور جب بہت سے مُرید ہو جاتے تھے، تو ان کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر، ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اس کی نقل کر دو۔ آپ نے شجرے کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھ دیا، دوسرا حذف کر دیا؛ تیسرا پھر لکھ دیا، چوتھا پھر ساقط۔ غرض کہ اسی طرح بہت سے حذف و اسقاط کرکے نقل اور اصل جاکر ان کے حوالے کی۔ وہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا! مرزا نے کہا حضرت! آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے؛ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے، تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا، آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔" وہ یہ سُن کر بہت جزبز ہوئے، اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اُس کی نقل کرائی، اور مرزا ہمیشہ کے لیے اس تکلیف سے چھوٹ گئے۔

موت کی آرزو مرزا یا تو اس وجہ سے کہ ان کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی، اور یا اس لیے کہ ان پر ناملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا، آخر عمر میں موت کی بہت زیادہ آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔

لطیفہ ۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنے مرنے کی یہ تاریخ کہی کہ "غالب مرد" اس سے

پہلے کئی مادّے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص، جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے، ان سے مرزا صاحب نے اس مادّے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: "حضرت! ان شاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا!" مرزا نے کہا: "دیکھو، صاحب! تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو؛ اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

لطیفہ ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "بھئی، کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے، تو تف بریں وبا۔" اسی قسم کی بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

اخیر عمر کی حالت مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے، کپڑے اتار کر بیٹھے ہی بیٹھے، کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا، اور پھر چوکی سے اتر کر پلنگ تک آنا، ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا؛ مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر، یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے۔ یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرض الموت کی حالت مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی؛ پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوگا، اس سے شاید ایک دن پہلے میں اُن کی عیادت کو گیا تھا؛ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا، اور نواب علاء الدین احمد خان مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور

ایک فارسی کا شعر، جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو! ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا، دوسرا مصرع یہ تھا:

بکرد ہجر مدارا بمن، سرِ تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے　　عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

تاریخ وفات

آخر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۵ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائینِ مزار دفن کیے گئے۔ ان کی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں؛ صرف ایک تاریخ جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا، یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی "آہ غالب بمرد" جس کو مختلف لوگوں نے مختلف طور پر قطعات میں منتظم کیا تھا۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر مہدی حسین مجروح اور مؤلفِ کتابِ ہذا نے اردو میں اور منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی میں مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے، جو اسی زمانے میں چھپ کر شائع ہو گئے تھے۔

جنازے کی نماز

مرزا کے جنازے پر جب کہ دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی، راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ، جیسے نواب ضیاء الدین احمد خان، نواب محمد مصطفیٰ خان، حکیم احسن اللہ خان وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقے کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرہ بخشی محمود خان نے نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے، ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق ان کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہلِ سنت کے موافق ادا کیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی اور مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا، مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا

کہ شیعہ اور سُنی دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاؤ سُنی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے ان کی حق گزاری میں شریک ہوتے۔

شاگردوں کی کثرت

مرزا صاحب کے شاگرد اطرافِ ہندوستان میں بے شمار تھے۔ اُن کی وسعتِ اخلاق اور عام رضاجوئی نے یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ جو شخص اصلاح کے لیے ان کے پاس غزل بھیجتا تھا، ممکن نہ تھا کہ وہ اس کے خط کا جواب اور اس کی غزل میں اصلاح دے کر نہ بھیجیں۔ اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے، جیسا کہ انھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ما ہُماے گرم پروازیم فیض از ما مجوے   سایہ ہمچو دُود بالا می رود از بالِ ما

باایں ہمہ اہلِ دہلی اور نواحِ دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیضِ صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے، ان کے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے جیسے **نیر رخشاں**، **عارف**، **سالک**، **مجروح**، **علائی**، **تفتہ** وغیرہم۔ ان کے سوا خاص اہلِ دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو عرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے، لیکن درحقیقت ان کے شاگردِ معنوی تھے، جیسے نواب **مصطفیٰ خاں** مرحوم جنھوں نے **مومن خاں** مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اُردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید **غلام علی خاں** مرحوم متخلص بہ **وحشت** جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور ان کی صحبت سے مستفید رہے تھے۔ مرزا نے انھیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنے ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے:

وحشت و **شیفتہ** اب مرثیہ لکھیں شاید   مر گیا **غالبِ** آشفتہ نوا کہتے ہیں

لطیفہ

یہ دونوں صاحب باہم دگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان کی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ ایک دفعہ جب

راقم بھی جہانگیر آباد میں موجود تھا، سید غلام علی خان مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے، اور مرزا صاحب نے بھی ان کا یہاں آنا سن لیا تھا۔ انھیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے پاس آیا۔ اس میں خان صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا:

چو با حبیب نشینی و چائے پیمائی بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سن کر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا، جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے تصرف سے اس میں لطف پیدا ہو گیا ہے

مرزا صاحب کے ان شاگردوں کا حال جن کے نام کے بہت سے خطوط اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں، یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں، اس لیے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں: ایک نواب ضیاءالدین احمد خان مرحوم اور دوسرے نواب مصطفیٰ خان مرحوم کہ غالباً ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اردو مکاتبات میں نہیں ہے، جس سے ان کی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام کو معلوم ہو۔

نواب ضیاءالدین احمد خان

نواب ضیاءالدین احمد خان جو فارسی میں نیر اور اردو میں رخشان تخلص کرتے تھے، قطعِ نظر کمالِ شاعری و انشاپردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علمِ انساب، علمِ اسمار رجال، تحقیقِ لغات اور جنرل انفورمیشن (عام واقفیت) میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے فنونِ مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف اپنے نام سے نہیں چھوڑی، لیکن اکثر مصنفین ان سے مدد لیتے تھے، اور جو مشکل پیش آتی تھی، اس میں ان سے مشورہ کرتے تھے، خصوصاً الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے، اس کی تصنیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی، جس کا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے۔

چونکہ نواب ممدوح اہلِ کمال کے عاشق تھے، اور خاص کر مرزا صاحب سے ان کی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں اس لیے مرزا کے ساتھ ان کو خاص تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکرِ شعر کرتے تھے! مگر زیادہ تر فارسی

نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جس میں ان کا استاد ہونے پر فخر کیا ہے، اس کے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں:

صد آفتاب تواں ساختن بہ بازیچہ
ز ذرۂ کہ بود در ضیاے نیرِ من
نہ ایں سپہر و نہ ایں مہر عالمے دگر است
من آسمانم و اُو مہرِ نور گسترِ من
من آں سپہرِ کہ دائم، چنانکہ مہر بماہ
بہ مہر نور دہد نیرِ منورِ من
من آں سپہر کہ ہر دم رسد عطیۂ فیض
بہ سعدِ اکبرِ گردوں از سعدِ اصغرِ من
منم خزینۂ راز و درِ خزینۂ راز
ضیاے دینِ محمد کہیں برادرِ من
بہ دین و دانش و دولت، یگانۂ آفاق
بعمر کہترِ و از روے رتبہ بہترِ من
بمہر دل بہ برادر دہم، نہ یعقوبم
کہ پورِ خویش بود دلستان و دلبرِ من
سخن سرائے نوآئین نوائے رانازم
بنازِ تہنیتِ من، بہ شعر ہمسرِ من
بہ نکتہ شیوۂ شاگردِ من، بمن ماناست
صنم بصورتِ خود می تراشد آزرِ من
اگرچہ اُوست ارسطو و من فلاطونم
بود بہ پایہ ارسطوے من سکندرِ من
زمینِ کوے مرا آسمان کند ہر صبح
طلوعِ نیرِ رُویش ز طرفِ منظرِ من

اگر شوم بہ مثال آتشے شرارہ فشاں
شود بہ قاعدۂ ہمدم سمندرِ من
بہ بحر گر فتدم رہ، بود سفینۂ من
بہ تخت گر بودم رائے، گردد افسرِ من
بہ مہر دوست دہم دل، نشاطِ خاطرِ من
بہ کینِ خصم نہم رُخ، لوائے لشکرِ من
گرم ز غصہ تبہ گشتہ کار، مونسِ من
ورم ز کار فرو ماندہ دست، یاورِ من
زہے ز رُوئے تو پیدا فروغِ دانش و داد
بدیں فروغِ جہاں تاب گشتہ اخترِ من
ز تو کہ آئینۂ فیضِ صحبتِ اُولیٰ
ہوائے دیدنِ غالب فتادہ در سرِ من
مرا ستودی و گفتی کہ من ازانِ توام
فدائے آنِ تو بادا اقلّ و اکثرِ من
سعادت و شرفِ چوں منے بعرضِ کمال
زبس بود کہ بود چوں توئی ثناگرِ من

نواب محمد مصطفیٰ خان

نواب محمد مصطفیٰ خان مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے، بلکہ جب تک مومن خان مرحوم زندہ رہے، انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے، لیکن خان موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے؛ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل ان کی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی، اور شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جن کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

نواب ممدوح کی شان میں بھی مرزا کا ایک فارسی قصیدہ ان کے دیوان میں موجود ہے جس میں اوّل فخریہ تشبیب لکھی ہے۔ فخریہ اشعار لکھتے لکھتے کہتے ہیں:

دستِ رد بر تاجِ قیصر می نہم
پشتِ پا بر تختِ خاقاں می زنم
خُردہ می گیرند بر من قُدسیاں
گر نفس در مدحِ سلطاں می زنم
آں ہمای تیز پروازم کہ بال
در ہوای مصطفیٰ خاں می زنم
عرفی و خاقانیش فرماں پذیر
سکہ در شیراز و شروان می زنم
او خداوند است و من چاوش وار
بانگ بر اجرام و ارکاں می زنم
گلشنِ کویش گزرگاہِ من است
دوش در رفتن بہ رضواں می زنم
خوبیِ خویش بد آموزِ من ست
دم ز یاری می زنم، ہاں می زنم
مہرورزی بیں کہ باشم ہمنشیں
من کہ زانو پیشِ درباں می زنم
بشنود بے آنکہ یاد آں را بَرد
نالہ گر در کنجِ زنداں نی زنم
بنگرد بے آنکہ کلک آزا کشد
نقش گر بر صفحۂ جاں می زنم

دوسرا حصّہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب

تمہید

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا اور اس کی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ایک ایسے زمانے میں جب کہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہو گئی ہے، اور ذوقِ شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں ہے وہ ان کی فارسی نظم و نثر ہے، لیکن اوّل تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے؛ دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں، جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں پس جو شخص اس زمانے میں ان کے کلام پر ریویو کرنا اور اس کے ذریعہ سے مصنف کی حقیقت اور اس کا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے، وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے، جس میں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کچھ امید ہے، تو اسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جائے، نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کر کے ان سے ہاتھ اٹھا لیا جائے۔

دفعِ غم نیست، جز بہ غم خوردن   چارۂ کار نیست، جز کردن

استعداد سبق

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی، بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ انہوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطورِ غزل کے موزوں کیے تھے، جن کی ردیف میں "کہ چہ" بجائے "یعنی چہ" کے

استعمال کیا گیا تھا۔ جب انھوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے، تو انھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ "کہ چہ" "یعنی چہ" کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور مرزا سے کہا: تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو، اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

مرزا کو، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربی و سرپرست ان کے سر پر رہا تھا۔ مرزا کی ننھیال، جہاں انھوں نے پرورش پائی تھی، بہت آسودہ حال تھی۔ اور ننھیال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُن کے بھائی سے بڑھ کر کوئی فائدہ اٹھانے والا نہ تھا۔ جب کہ سر پر کوئی مربی نہ ہو، دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز خانہ بر انداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اس آسودگی نے وہ کام کیا، جو کہ آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گزری ہے اس کی کیفیت کا خود انھیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

> با خِرد فرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگان ہمنشین و باد و باش
> ہمہ ننگ، پاے بیراہہ پوے و زبان بے صرفہ گوے در شکستِ خویش گردن را
> دستیار و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار

اس کے بعد لکھتے ہیں:

> تیزیِ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت و ہما و میکدہ را بیکدگر زد

الغرض مرزا کا لڑکپن اور ان کی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جس کا نہ کوئی قدر دان نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلیٰ درجے کا کمال بہم پہنچانا تو در کنار، اس کا خیال بھی دل میں گزرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف ان کی طبعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بےخبری

کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

دیوان ریختہ مرزا نے گُلِ رعنا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اوّل اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اس لیے ہم بھی پہلے ان کے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں۔

جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اردو شعر کہنا شروع کیا تھا، قطعِ نظر اس کے کہ اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے، اس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی میر نے، جو مرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا، اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب، فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور ان کی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو، جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہاں بطور نمونے کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

(۱) سُرے گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں زقالبہا

(۲) اسد ابر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن
بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب، امید رستن ہا

(۳) بحسرتگاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے ترجبیں پایا

(۴) رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا

(۵) پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

(۶) موسمِ گُل میں مےِ گلگوں حلالِ میکشاں
عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا
گویا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورۂ بالا شعروں میں قطعِ نظر اس کے کہ طرزِ بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے، خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی، جو کسی قدر آسان ہے، یہاں بطور نمونے کے شرح کی جاتی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشقِ سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا، ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی، تو اشارتِ فہم کے لیے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے، ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ و ایما کرنا، اور ناخنِ بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے، وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا، کیوں کہ ناخن کے کٹنے سے، جو ایک قسم کی فنا ہے، لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں، جو انھوں نے اپنے دیوانِ ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں، جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں:

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا   تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل   کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط   تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
شبِ خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا   تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی، مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہوں گے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے، تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دُکھا ہوگا! ظاہراً یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار، جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے، ان کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار ان کی نظر میں کھٹکے ہوں، مگر چوں کہ دیوان چھپ کر شائع ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے ان اشعار کا کاٹنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی، اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول ایسے رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامتِ طبع اور سلامتِ ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چین ہمعصروں کی گردہ گیری اور طعن و تعریض سدِ راہ نہ ہوتی، تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سُنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

لطیفہ ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا، اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے،

پہلے تو روغنِ گل، بھینس کے انڈے سے نکال   پھر دوا جتنی ہے کُل، بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا، حاشا یہ شعر میرا نہیں ہے۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کہا، میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں

اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی دیوان میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ اردو میں ایک جگہ کہتے ہیں:

نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حالِ دل ظاہر نہیں ہوتا، تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے، کیوں کہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چوں کہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اس لیے نکتہ چینیوں کی تعریضوں سے ان کو بہت تنبّہ ہوتا تھا، آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اس کے سوا جب مولوی **فضل حق** سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُن کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے، تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک شروع کی، یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا، دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اُس کے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی، ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبولِ خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے، انھیں کو جب اہلِ زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے، تو ان کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ اِدھر قائل کے منہ سے نکلا، اُدھر سامع کے دل میں اتر گیا، مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے، ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروفِ

ربط اور توابع فعل، جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں، ان کو مرزا اردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوبِ بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے، جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً ان کے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ 'اے' کی جگہ 'جز' پڑھو، معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں، ان کے جگرِ سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے، ظاہراً یہ انھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سُن کر کہا کہ "اگر اے کی جگہ جُز کا لفظ رکھ دیتے، یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے: 'اے نالہ! نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے؟'، تو مطلب صاف ہو جاتا۔" اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے تھے، اور شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو، یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے، اُسی پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیں اور لیک کے اِدھر اُدھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں؛ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِ مو تجاوز نہ کریں، اور ان کے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں؛ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے، بلکہ دوسرے رستے پر چلنا ان کی قدرت

سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اُرِجنیلٹی یا غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے، وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ ان کو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہمجنسوں کو چلتا دیکھتے ہیں، اس پر چلنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزلِ مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں، عام راہگیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارعِ عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ خِسّتِ شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

لطیفہ ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلی میں آئے تھے، مرزا کے ایک شعر کی ان کے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا: ارشاد تو ہو، وہ کون سا شعر ہے؟ انھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش، رحمت خدا کی

چوں کہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا، انھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سن کر بہت چِز بِز ہوئے اور فرمایا: اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی، اور اگر مجھ اسد کا یہ شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی!

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اس لیے ناگوار گزرا ہوگا کہ "مرے شیر" اور "رحمت خدا کی" یہ دونوں محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا، یہ بھی ان کی طبیعت کے خلاف تھا کیوں کہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو، جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں، مبتذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف

شاعری میں، بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریقِ ماند و بود میں، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے۔

لطیفہ مرنے سے آٹھ سات برس پہلے انھوں نے ایک مادۂ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا، جس میں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اسی سال شہر میں وبا آئی، مگر مرزا بچ گئے۔ اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں:

> میاں، ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اس سنہ میں مجھے مرنا چاہیے تھا)، مگر میں نے وباے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔
>
> بعد رفعِ فساد ہوا کے سمجھ لیا جائے گا۔

اگرچہ یہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے، مگر ان کی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب، جس کو یہ خط لکھا ہے، وہ ان کی اس خصلت سے خوب واقف ہے۔

بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بے راہ روی سے خبردار ہوئے۔ اور استقامتِ طبع اور سلامتیِ ذہن نے ان کو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ گو اُن کا ابتدائی کلام جس کو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے، مقبول نہ ہوا، مگر چوں کہ قوتِ متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا، اور اس لیے اُس میں غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی، جب قوتِ ممیزہ نے اس کی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُس نے وہ جوہر نکالے، جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا، بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُپج سے، کبھی دوستوں کی فرمائش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولیعہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتدبہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> بھائی صاحب، تم غزل کی تعریف کرتے ہو، اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہکو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے،

> کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔

قطع نظر اس کے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعے میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے، کہتے ہیں:

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من ست
راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید　　ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من ست

مگر چوں کہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اس لیے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔ لطف علی خان آذر آتشکدہ میں **انوری** صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اس کے دیوان کا مختصر ہونا بھی اس کے کلام کی خوبی اور حسنِ طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا، ورنہ **فردوسی** و **نظامی** دونوں مثنوی میں اور **انوری** و **خاقانی** دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے، کیوں کہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رکنِ رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرورت ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اردو کلام میں

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات، گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں، لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے، اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا۔ جس کو امید ہے کہ اہلِ انصاف تسلیم کریں گے۔

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اوّلاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آئے ہیں، وہی مضامین بہ تبدیلِ الفاظ اور بہ تغیرِ اسالیبِ بیان عامۂ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں۔ چنانچہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہلِ زبان میں گزرے ہیں، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں، جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں، جو سب سے نرالا ہے؛ اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں، جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے تو اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرمو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے اگلوں نے راہ طے کی تھی اسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اوّل شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا،

اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا، تو ان کو بھی آخر اسی رُخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے، اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے:

اخلاق

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا۔

فطرتِ انسانی

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!　　نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں، نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک معلوم ہے، ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں، بلکہ فیکٹ ہے کیوں کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے؛ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

ترجیع

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعے کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعے سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا، تو کیا بڑائی ہوتی۔ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا، تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا! مطلب یہ کہ خدا ہوتا کیوں کہ پہلے مصرعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

اخلاق

توفیق باندازۂ ہمت، ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے، اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے، اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے، تو اس کی فہم کا قصور ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے، اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی، تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

عاشقانہ

لاگ ہو، تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا

"لاگ" دشمنی اور "لگاؤ" محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا، تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے، نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی، تو اس لیے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اس کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی، تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں، اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔

تفضیلِ انواعِ انسانی

دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر   کرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طُور پر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا"۔ شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے، نہ کوہِ طور کیوں کہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے پس کوہِ طُور، جو منجملہ جمادات کے ہے، وہ کیوں کر تجلیِ الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اُس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

شوخی

دعا قبول ہو، یارب، کہ عمرِ خضر دراز!   حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز

چوں کہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اُردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے۔ مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی! خضر کی عمر دراز ہو، یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔

شوخی

مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ   آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے، جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ؛ اور در پردہ الزام دیتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیوں کر دوں! وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں، تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں، جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے مراد یہ رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بہ سبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا؛ اور وصل

میسّر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں، اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

شکایت اہل وطن

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

پردیس میں مرنا، جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اس پر خدا کا اس لیے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے، تو کچھ مضائقہ نہیں کیوں کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خریدار و غم خوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہوتی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایے میں ظاہر کیا ہے۔

تصوف

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے، اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیتِ ذات ہے، جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے، اور اس کو شہود سمجھنے میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے، مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے بے مثال نہیں ہو سکتی تھی۔

عاشقانہ

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی، اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی

اخلاق

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرالا خیال ہی نہیں، بلکہ فیکٹ ہے اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضدِ حقیقی یعنی ان کے آسان ہوجانے سے کرنا، درحقیقت حسنِ مبالغے کی معراج ہے جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

عاشقانہ

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہوجانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا، تو کچھ دقت نہ تھی کیوں کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے، اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے: مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے کیوں کہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

تصوف

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے، لوگ عبادت اس امید پہ کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شرابِ طہور وغیرہ ملے گی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

حسنِ بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے، وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے

ہی سے میرے دل میں تھی۔

اخلاق

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور بالکل نیا خیال ہے، جو کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

تصوف

رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا، جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے، تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح مے خانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

ناامیدی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے

ناامیدی کی غایت اس سے بڑھ کر، اور ایسی خوبی سے، شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں، اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے، تو جو گناہ بسبب عدمِ قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی، ان کی داد بھی ملنی چاہیے۔

علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولاً، عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں، مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے، ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں

ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں، وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے گرداب کو شعلۂ جوّالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وصال سے استخوان کو خشت اور بدن کو قالبِ خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختے میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی، اسی قدر تشبیہوں میں، باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

مثال ۱

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہر گردوں ہے چراغ رہگزارِ باد یاں

یہاں سورج کو، اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں، 'چراغ رہگزارِ باد' سے تشبیہ دی ہے، جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

مثال ۲

دوسری جگہ سورج کو، اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلے میں اس کو ناقص الخلقت قرار دیا ہے، ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے چنانچہ کہتے ہیں:

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

مثال ۳

ایک جگہ انسان کی زندگی کو، اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں،

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

اس قسم کی نادر و بدیع تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان —— اردو اور فارسی —— بھرے ہوئے ہیں۔ قطعِ نظر تشبیہات کے، مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ

پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے، ابتذال سے بہت بچتے تھے۔ مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں، جس قدر ان کے کلام میں کم ملیں گی، ظاہراً کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں۔ مثلاً صلِ علیٰ کا لفظ جو بجائے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے، اس کو کبھی جائز نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نامِ خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے۔ اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص ان کو کبھی نہیں بولتے، تابمقدور وہ ان کو استعمال نہیں کرتے تھے، اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہیے، وہ فوت ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں، ان کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے، ریختہ میں بھی نسبتہً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاوراتِ اردو میں بلاشبہہ استعمال کیا ہے لیکن استعارے کے قصد سے نہیں، بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلاقصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

مثال ۱

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا!
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے، اس طرح ادا کیا ہے: بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا!

مثال ۲

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی، اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے، اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے، اس

کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے، ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے، جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

مثال ۳

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ   دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثال ۴

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے   اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

مثال ۵

درماندگی میں، غالب! کچھ بن پڑے، تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا، اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

ان اشعار میں، جیسا کہ ظاہر ہے، اصل خیالات سیدھے سادے ہیں مگر استعارے اور تمثیل نے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کر دی ہے۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں، کیا نثر میں کیا نظم میں، باوجود سنجیدگی و متانت کے، شوخی و ظرافت ہے، جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور ہوئے ہیں: ایک سودا دوسرے انشا، مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجوگوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی۔ بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے، جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے، اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ، جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں؛

مثال ۱

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہیں ہو گی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے

مثال ۲

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق!
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں، مے مرد افگنِ عشق کا ساقی، یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا، اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد، جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع، یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں، اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں کہتا ہے، کون ہوتا ہے حریفِ مرد افگنِ عشق؟ یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا، تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے: کون ہوتا ہے

حریفِ مے مرد افگنِ عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجے اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے؛ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعِ مذکور کی تکرار کرو گے، فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

مثال ۳

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا، تو وہ ایمان لے لے گا، اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بُت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر اس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جا سکتی ہے!

مثال ۴

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند   گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا، تو اس کو گوارا نہ ہوتی، اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصے کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا: کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خوں ریزی کرے؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ ”تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں“ اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی، اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں؛ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

مثال ۵

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے، اس لیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

مثال ۶

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ترے سر کی قسم ہے، ہم ضرور سر اُڑائیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ ہم کو ترے سر کی قسم ہے، یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے، یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

مثال ۷

الجھتے ہو، تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں، تو شہر کا کیا حال ہو؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں، تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین اور موجود ہوں، تو تم کیا قیامت برپا کرو!

مثال ۸

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

"ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس میں دو معنی رکھے ہیں؛ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے، اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔

مثال ۹

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے!

"کون اٹھاتا ہے مجھے" اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے، اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے؛ دیکھوں اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

مثال ۱۰

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں 'بادپیمائی' کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے

ہیں۔ باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں۔ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا اور باد پیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے۔ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح 'باد پیمائی' کے معنی ہوا کھانے کے لیے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے

مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے، جو مرزا اور ان کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے۔ جو جذبات اور خیالات اہلِ ایران نے غزل کے پیرایہ میں ظاہر کیے ہیں، ریختہ گویوں نے زیادہ تر، بلکہ بالکل انھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا، ضرور تھا کہ وہی انقلاب اردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔ قدمائے اہلِ ایران، جن کا دور مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے، ان کی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں، وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے اور گو اسالیبِ بیان میں تلاحقِ افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہو گئی، لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا؛ مگر چوں کہ خیالات نہایت محدود تھے، ایک مدّت کے بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے، وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لیے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے، تو اُن کے لیے میدانِ غیر متناہی موجود تھا۔ مگر انھوں نے اس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا۔ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، انھوں نے تو اُسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی۔ مگر جن کی فطرت میں اُرِجنیلٹی اور اُپج کا مادہ تھا، وہ انھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنان چہ نظیری، ظہوری،

عرفی، طالب، اسیر اور ان کے اقران و امثال کی غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں۔ مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں:

گناہ اگرچہ نہ بود اختیارِ ما، حافظ! تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اس میں ایک نئی طرح کی لطافت پیدا کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ بینمش می آرم اعترافِ گناہِ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں:

از عدالت نہ بود دور، گرش پرسد حال پادشاہے کہ بہ ہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادا خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں جو کہ اس کا ممدوح بھی ہے، اور محبوب بھی، ایک نئے انداز سے بندھا ہے، وہ کہتا ہے:

مروت کرد شبہا بر تو سیرِ بام و در لازم نمی باشد چراغے خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چوں کہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا، اس لیے مروت اور کرم نے تجھ پر لازم کر دیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر چڑھ کر ٹہلا کرے، تاکہ تیرے چہرے کی روشنی سے ان کے گھر میں چاندنا ہو جائے، مطلب یہ کہ ان کے حال سے واقف ہو کر ان کی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیوں کہ نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی، جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں۔ لیکن ریختہ میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا کیوں کہ متاخرین اہلِ ایران کا نمونہ موجود تھا اس لیے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے، اسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی، کیوں کہ جس طرح کیمسٹری کے مدون ہونے اور علم کے درجے تک پہنچنے سے پہلے، اس کے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح

مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آجاتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور انھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، داغ وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا، خصوصاً مومن خان مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کرکے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے۔ مثلاً میر تقی کا شعر ہے:

میرے تغیرِ رنگ پر مت جا　　　اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغیرِ رنگ کو مومن خان نے اس طرح باندھا ہے:

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رخِ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے:

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور　　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خان داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے: وہ کہتے ہیں:

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں غالب، مومن اور اُن کے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چوں کہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اس لیے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)
ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

(۲)
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے (۳)

ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے (۴)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے!
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے! (۵)

اس کی بزم آرائیاں سن کر، دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے (۶)

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے (۷)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یہاں تک مٹے کہ، آپ ہم اپنی قسم ہوئے (۸)

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے (۹)

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے، پر نہیں آتی

۱؎ شعر ۱ میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہتِ گل سے حیا

آنی، چوتھے میں بھول سے سینکڑوں وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا، چھٹے میں دلِ رنجور کا نقشِ مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچے سے نقش کا مصور سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمتِ عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی — یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لے کر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں، اور اگر تھیں تو صرف اس قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی طبیعتیں روز بروز نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں، لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں، جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی باتوں سے ان لوگوں کی استادی اور گراں مائگی میں کچھ فرق نہیں آتا، جن کو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔

بہر حال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ اور جامی کے کلام سے ہے، تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا اور درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیے۔ قدمائے اردو روزمرہ اور صفائیِ بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیبِ بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصودِ شاعری) تصور کرتے تھے۔ چناں چہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی! شاعری، معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔"

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے، لیکن چوں کہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے، اس لیے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ

مرزا کے دیوانِ ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں، وہ بطورِ انتخاب کے یہاں نقل کر دیے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں، ان کو اب مکرر نہ لکھیں گے، اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائیں گے اور کہیں کہیں محاسنِ شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا۔

رندانہ

ستایش گر ہے زاہد، اس قدر جس باغِ رضواں کا   وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں؛ طاقِ نسیاں کا گلدستہ، وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھ کر بھول جائیں۔ بیخودوں کا بہشت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے، جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

تصوّف

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے، ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں، وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے ہیں اور بج رہے، اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

عاشقانہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب   خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا، وہ مژگانِ یار کی امانت تھی اور اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا، جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

عاشقانہ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح!   کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا۔

تصوّف

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ظرافت

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالب!   تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا:

"بھئی، ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے" مرزا نے کہا: "حضور نواب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔"

عاشقانہ

نہ مارا جان کر بے جرم غافل! تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خونِ بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے، مگر اب تیری گردن پہ بجائے خونِ بے گناہ کے حقِ آشنائی کا رہے گا۔

عاشقانہ

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

شوخی

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

خندۂ گل کو خندۂ بے جا اس لیے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھ کر یا ازراہِ تعجب نہیں ہنستا، پس گویا اس کا خندہ بے محل ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد! — جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے، کیوں کہ فلک سے جو جفا سرزد ہوتی ہے، اس کے حکم سے ہوتی ہے۔

توبہ

میں، اور بزمِ مے سے، یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

یعنی اس نے زبردستی کیوں نہ پلا دی!

دل کی حقیقت

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلا کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

شوخی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا، دمِ تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، صرف فرشتوں کا لکھنا ہی کافی نہیں ہے۔

عاشقانہ

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

حوصلۂ گناہ

دریاے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودے کہ دریاے معاصی خشک ہوگیا، مگر ابھی ہمارے دامن کا پلّہ تک نہیں بھیگا۔ تذکرۂ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہٖ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سن کر اس کی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ "اس میں مرزا کا کیا کمال ہے، یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے" غرض کہ ایک ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے یا اس کی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اُس سے بھی زیادہ نکلے۔

عاشقانہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص، حیف!
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟

رقابت

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرمِ راز اور ہم نشین تھا، وہی سن کر میرا رقیب بن گیا، کیوں کہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی، اور وہ بھی مجھ سے جادو بیان کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیاں اپنا" سارے شعر کی جان ہے، جس کی خوبی بغیر ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

ظرافت

دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا!

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان کا نکلا، اب ہمارے لیے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے، ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے، اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے، ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

شکوۂ چرخ

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے!
بے سبب ہوا غالب! دشمن آسماں اپنا

آسماں کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں، اور اپنی دانائی و ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔

عاشقانہ

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!   تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہوگی تو ہم اس کو ضبط کریں گے اور اس کا اثر تجھ تک پہنچے گا۔

صبر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!

شوخی

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ   مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا!

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھیے کہ مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

توحید

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے   شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

توحید

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل   جہاں ساقی ہو تو، دعوی ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے، مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے، تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو، وہاں ہوشیاری کا دعوٰی چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے

تصوف

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گزر جائے گا تو مر جائیں گے۔ گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گزر جانا، یہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔

عاشقانہ

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد   تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا   باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال   ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا   روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

عاشقانہ

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، غالب!   یار لائے مرے بالیں پہ اسے، پر کس وقت

شوخی

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن   جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر، کہے بغیر

شوخی

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات   سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

عاشقانہ

واحسرتا کہ، یار نے کھینچا تم سے ہاتھ!   ہم کو حریفِ لذتِ آزار دیکھ کر

قدر سخن سنجی

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ   لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

رضا

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہوا ہے، راہ کو پُرخار دیکھ کر

عاشقانہ

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا   یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

شکوۂ ابنائے زماں

یارب! نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات   دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں درپردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے، جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

تصوف

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں   ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور "ہم" کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک ہماری ہستی باقی ہے، اس وقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے، تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے   رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی ندی نالے، نہ آہ و نالے۔ مثال کس قدر ممثل لہٗ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسبِ حال لکھتا ہے، وہ نہایت موثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔

غلط فہمی

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے!   متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاعِ بُردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم وستم رسیدہ وفلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے، وہ عشق ومحبت کی بدولت ہے، خولہ زن وفرزند کی محبت ہو، خولہ مال ودولت کی، خواہ ملک وملت کی، خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں

عاشقانہ

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن   غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

شکوۂ اہلِ وطن

تھی وطن میں شان کیا، غالب! کہ ہو غربت میں قدر   بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے، تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں

عاشقانہ

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر! ورنہ   کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیوں کر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں، مگر چوں کہ وہ ملتا ہی نہیں اس لیے نہیں کھا سکتا۔

رندانہ

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

معاملہ

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پاے سخن درمیاں نہیں

شوخی

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، اگر دہاں نہیں

فخریہ

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہاں "ہم زباں" کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ اگرچہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی، اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے، ویسی رُوح القدس کی نہیں۔

عاشقانہ

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں، زنجیر نہیں

چکر، پھرنے کی وحشت۔ کہتے ہیں اس کے پاؤں میں چکر ہے یعنی اُس کو پھرنے کی وحشت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے، اُسے زنجیر نہ سمجھو، بلکہ چکر سمجھو۔

عاشقانہ

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جادہ یعنی بٹیا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چوں کہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے، اس لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

عاشقانہ

الفتِ گل سے غلط ہے دعویِ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو، دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

تصوّف

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلے پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

عاشقانہ

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے   ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو، یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا، تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔

عاشقانہ

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ   ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

یہ شعر سہلِ ممتنع ہے، اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

شوخی

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں   یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یعنی آج اس خوف سے شراب نہ دینی کہ کل نہ ملے گی، ساقیِ کوثر کی فیاضی پر سوءِ ظن کرنا ہے۔

عاشقانہ

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر   آنے کا وعدہ کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں   میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطورِ طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اس لیے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے: "پھر آج جو خلافِ عادت جام

کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے " اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو، اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہیں، وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں، محسناتِ شعر میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

عاشقانہ

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا   لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور نگاہ کا چرانا ایک طرف؛ اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں کر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے۔ جن میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرعے میں ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیاں ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے، مگر اس کا آنکھ چرانا، جو لگاوٹ کی ضد ہے، وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلآویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے، مگر اس کا غصے میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحبِ ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ کے رُوبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چوں کہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اس لیے مرزا کا کلام سن کر اکثر الجھتے تھے اور اُن کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے؛ مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے، اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا: مرزا غالب کا۔ چوں کہ وہ مرزا کے شعر کی بھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اُس روز لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منھ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سن کر بطورِ مزاح کے جیسی کہ اُن کی عادت تھی، فرمایا: "اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے، یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر

ہے۔" مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے، جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے، یہ اسلوبِ بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

انسان کی مجبوری

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُس کے قابو سے باہر ہونا، چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا، حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے۔

تصوف

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسویٰ اللہ مراد ہے، جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے کیوں کہ وہ وجودِ واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ماسویٰ کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں رہتا ہوں، اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے۔

تصوف

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کو ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ "یہاں کیا دھرا ہے"، منتہائے بلاغت ہے۔

منقبت

غالبؔ! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتُراب میں

عاشقانہ

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

سلوک

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُس کو اس تمثیل میں بیان کیا

ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے، اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے: اور اس کے ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے، تو اس کا تعاقب کرتا ہے! وہلُم جراً۔ اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

تصوف

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن   ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

شکوۂ اہلِ وطن

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت، غالب!
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

عالی ظرفی

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا   یاں آپڑی یہ شرم کہ، تکرار کیا کریں!

اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار کیا ہے۔ یعنی میں، جو دونوں جہان لے کر خاموش ہو رہا، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اُن پر قانع ہو گیا، بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی، اس لیے خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ میں تو خود ان سے انہی کو مانگتا تھا۔

تصوف

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

شوخی

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"   سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں؟"

ستم ظریف، وہ ظریف جس کی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھ کر کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے؛ اُس نے یہ سُن کر مجھے بزم سے اٹھوا دیا یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

عاشقانہ

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر   عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ، سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا: "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے، دوسرے مصرع میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے یعنی، کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا!!

شوخی۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

شکایت

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

تناسخ

سب کہاں کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں!

انتظار

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کیوں کہ جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا، اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

عاشقانہ

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پہ تری زلفیں پریشاں ہوگئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ

پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

شوخی

واں گیا بھی میں، تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں، دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے، وہ یہ ہے کہ، گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے کیوں کہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ، ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا' جب کہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

تصوّف

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں، تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں۔

تصوف

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا　　دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

تصوّف

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

ناگزیری غم

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

اخلاق

حسد سے دل اگر آزردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقتِ واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا؛ لیکن جس قدر اس کا دائرۂ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اُس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوش حالی محض اتفاقی نہیں ہے، جس پر حسد و رشک کیا جائے، بلکہ ان کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس لیے انصاف و فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو"۔ جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے، اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

وفاداری

کعبہ میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

نگوں طالعی

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

استقلال

آئے اگر بلا، تو جگر سے ٹلے نہیں
ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

عاشقانہ

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

شکر بے سروسامانی

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا!
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

رندانہ

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید   مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہِ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ، جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا، جب وہی چھٹ گیا، اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو، سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہِ شوخی کے کی گئی ہے، یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں، وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

تصوف

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست   لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو!

اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا (شکایت) وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتا ہے۔

تصوف

یہ کہہ سکتے ہو؟ ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو، آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوقِ حقیقی ہے۔

رندانہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

عاشقانہ

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے   تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی!

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی   فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غمِ دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے، تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا

پڑتی ہے۔ اور چوں کہ وہ جفا پیشہ ہے، اس کے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

شوخی

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

"غلط بردار" اس کاغذ کو کہتے ہیں، جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہِ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں: جس پر حرفِ غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا، سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں جاتی، وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

تصوف

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ، معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمنِ دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدومِ محض ہیں، ان کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے، جس کے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

عاشقانہ

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

شکایت

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

عاشقانہ

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

شوخی

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے؛ اور وہ یہ ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت   می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

معاملہ

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے   بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
غیر کو یارب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے   گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملے کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے، اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعے میں پائی جاتی ہے. ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے، پھر اس کے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے. بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ "گر حیا بھی اس کو آتی ہے" یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بے جا سے اور "شرما جائے ہے" یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے۔

عاشقانہ

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا   رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ   ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

نا امیدی

بس ہجومِ نا امیدی، خاک میں مل جائے گی   یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

عاشقانہ

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا   تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بہ سبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی، اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بزمانۂ حال ہو جائیں گے. پس تم کیا گئے، گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں: نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آ جانا۔

رشک

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟

شوخی

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

عاشقانہ

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

شکایت

ہو چکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

حسرت

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ضبط راز

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی!

شوخی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بے خودی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

عاشقانہ

ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے!

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو نازو نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہے۔ اس لیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

عاشقانہ

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش، پوچھو کہ مدعا کیا ہے

شوخی

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ شبنہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب، جو مرنے سے پہلے پی تھی. محض از راہِ شوخی کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال جواب کیے چلے جائیں۔

تصوف

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

نتیجۂ بے اعتدالی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے

گرفتاریِ دنیا

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

شوخی

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

عاشقانہ

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمنِ دلیل ہے: معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لیے کہا ہے کہ اس کو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

شوخی

بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اخلاق

بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

عاشقانہ

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب سعدیؒ کا بھی ایک شعر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

گفتہ بودم چو بیایی، غمِ دل با تو بگویم   چہ بگویم کہ غم از دل برود، چوں تو بیایی

دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مغموم ہے کیوں کہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے، نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے۔ مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا۔ بایں ہمہ سعدی کے شعر کو بہرحال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیے کیوں کہ الفضل للمتقدم

عاشقانہ

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض   اک برہمن نے کہا ہے کہ، یہ سال اچھا ہے!

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں، نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا، یا وبا نہیں آنے کی، یا لڑائیاں نہیں ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔

شوخی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن   دل کے خوش رکھنے کو غالب! یہ خیال اچھا ہے

شکایت

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا   اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

عاشقانہ

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم   آپ اٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے
رکھیو غالب! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے!

شوخی

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز   سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

زارنالی

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب! کئی دیے ہوتے

عاشقانہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

عاشقانہ:

عشق نے غالب! نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غزل بہاریہ شکرِ صحتِ بادشاہ

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک!   اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر   رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا رُوئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے   چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادپیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب!   شاہِ دیندار نے شفا پائی

عاشقانہ:

کب وہ سنتا ہے کہانی میری!   اور پھر وہ بھی زبانی میری

شکایتِ ناقدردانی

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے، جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا ہے اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گزرے۔ یعنی ہوں تو گراں قدر، مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں، پس میری گرانی کس قدر ارزانی ہے۔

عاشقانہ:

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا   کھل گئی ہیچمدانی میری
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   لکھ دیجیو یارب! اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور   دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

لفظ "تو" نے جو دوسرے مصرع میں ہے، یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ اس لیے دوست کے سرِ انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی

ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

عاشقانہ

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟ یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسُو کی

بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ 'یہاں' سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے کیوں کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

نیچر کی ہدایت

چاک مت کر جیب، بے ایامِ گل   کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاک گریبان سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے، تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

رندانہ

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

تصوف

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ "ہے"، "نہیں ہے"

رندانہ

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد!   مے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجبِ ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے، اس کو شراب پینے کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

انتظار

ہائے، وہاں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا!   لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے   تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے، بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

عاشقانہ

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ! مجھی سے ہو گئے   عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

شوخی

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے   جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کیے ہیں، اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے، نیکی نہیں کر سکتا۔

عاشقانہ

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے   کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی   نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قوئے جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی، ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے۔ پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے، نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

تصوف

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک   اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

عاشقانہ

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جائے   نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

اخلاق

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ!   خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!

عاشقانہ

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے   دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا، بے شرم و بے باک ہونا۔ پاک، آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا؛ اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزاد دل

اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

تصوف

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ　　　کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے، اس کو تغافل کے ساتھ؛ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے:

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ　　　دور تو و نزدیک ترا حال تباہ
کس نیست کہ جان از تو سلامت ببرد　　　آں را بہ تغافل کشی، ایں را بہ نگاہ

اِس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اُس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اس نے توجہ کی، تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

تصوف

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی　　　مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت — یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو ہونا، دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی، بلکہ اُس کے لیے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہ ہو، یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

عاشقانہ

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر　　　فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار میں گزر گئی، پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی؟

تعریض

بات پر وہاں زبان کٹتی ہے　　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اخلاق

نہ سنو، گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک دو، گر غلط چلے کوئی
ڈھانک لو، گر خطا کرے کوئی

شکایت

کیا کیا خضر نے سکندر سے؟
اب کسے رہنما کرے کوئی

مایوسی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب!
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی؟

زار نالی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

'خواہش پہ دم نکلنا' اُس کے پورے ہونے کے لیے جلدی کرنا۔ چناں چہ کہتے ہیں: کیوں دم نکلا جاتا ہے؟ یا کیوں مرے جاتے ہو؟ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو؟ پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہییں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

شکایت

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن!
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں 'بہت' کے لفظ پر زور دینا چاہیے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

شوخی

بھرم کُھل جائے ظالم! تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ وخم کا پیچ و خم نکلے

عاشقانہ

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

شوخی

کہاں مے خانہ کا دروازہ، غالب! اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

انتظار

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یہاں انتظار ہے

تصوف

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب! ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متہم بوجود ہے، اور فی الواقع اُس کی کچھ ہستی نہیں ہے، اُسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں؛ اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہو جاویں کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ غائب ہوا۔

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے، مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

شوخی

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی!
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

عاشقانہ

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

شوخی

غالب! اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخیِ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانے میں لکھی تھی جب کہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے لیے منت مانتے ہیں۔

مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا؛ اُدھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری!

رندانہ

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام، بہت ہے

قناعت و غیرت

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو
ہے یوں کہ، مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لیے کافی ہے، مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے، اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

عاشقانہ

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے، اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

عاشقانہ

بلا سے، اگر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

شوخی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

کوشش

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

اس سے زیادہ کوشش کی تخیّل کسی پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی۔

شوخی

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا، اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے، وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے۔ یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے، اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی، ایک یہ کہ پاسباں نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں۔ صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ 'شامت' اور دوسری پر 'قدم لینا' صاف دلالت

کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے، یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا، مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا۔ ان مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زمانہ عہد میں ہے اس کے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے پادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گزرانا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی، وہ ماہ بماہ ملا کرے چناں چہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ   اے جہان دارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں   تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی   ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز   روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری   ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی   جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں   پادشہ کا غلامِ کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح   تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا، صد شکر   نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!
آگ تاپے کہاں تلک، انساں!
دھوپ کھاوے کہاں تلک، جاندار!
دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار
ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ، اور پھروں ننگا!
آپ کا نوکر، اور کھاؤں ادھار!
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

شوخی

قطعہ ۲

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ آداب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے چوں کہ اردو

محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔ اس لیے مرزا نے اُس کو اس پیرایے میں بیان کیا ہے۔

قطعہ ۳

شکریہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے   مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر   جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے، تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لیے بطورِ اولوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اُس کے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے: یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔

لطیفہ جس وقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لے کر آیا، ایک باہر کا رہنے والا طالب علم، جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا، موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا: "ارے احمق، چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں: مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں

قطعہ ۴

شوخی

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو   اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو   روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا، جس کو سن کر بادشاہ اور تمام مصاحبین، جو دربار میں موجود تھے، بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

معذرت

سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آ پڑی　　مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد　　تین مسہل تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں، کس عمدگی سے بیان کی ہے۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

قطعہ ۶

شوخی

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے　　جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے　　کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

رباعیات

رباعی ۱

شوخی

مشکل ہے زبس کلام میرا، اے دل!　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں مجھ سے فرمائش　　گویم مشکل، وگر نگویم، مشکل

اس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں: ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں، تو مشکل یہ ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے؛ اور آسان نہ کہوں، تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے، اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں؛ پس ہر طرح مشکل ہے۔

رباعی ۲

شکریہ

بھیجی ہے مجھے جو شاہ جم جاہ نے دال ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی، جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اس کے شکریے میں لکھی گئی ہے۔

رباعی ۳

مبارکباد سالگرہ

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

رباعی ۴

شوخی

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے، اللہ اللہ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اس رباعی میں مرزا نے غایت درجے کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو، وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چوں کہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کام روائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

شوخی

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں! آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں!
روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

یہ رُباعی بھی اسی قطعے کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے، دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ۶

عاشقانہ

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے۔ ظلم سے ہاتھ اٹھانا اس سے دست بردار ہونا اور اس کو ترک کرنا۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

شکریہ

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغان شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے۔ اُس کے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہے۔

نثرِ اُردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ مگر سنۂ مذکورہ میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن "مہرِ نیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اُس وقت بضرورت ان کو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت "مہرِ نیمروز" کی ترتیب اور انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں، شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:
>
> مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ! اب عناصر میں اعتدال کہاں

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے، وہی اس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے، ویسی نظمِ اُردو اور نظمِ فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے اور ان کے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے، مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا، نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

> میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ دادِ سخن کہاں اور ادراکِ پایۂ معنی کہاں؟ تاریخِ نثریہ (یعنی مہرِ نیمروز) کے پانچ سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں، میری خاطر نہ کیجیے، انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو!

اگرچہ مرزا کی اردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض اوقات تحریروں میں دیکھا گیا کہ اردوئے معلی اور بوستانِ خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مرزا کی اردو نثر کے قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں؛ اور تین مختصر رسالے ہیں جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں؛ لطائفِ غیبی، تیغِ تیز اور نامۂ غالب۔ اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز ان کے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اردوئے معلی میں اور اس سے کم عودِ ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ ان کے چھپوانے کا ہے۔

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہو سکی۔ انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازمِ نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا، مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں، سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں؛ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

اداے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے، جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو انھوں نے اس طرح ادا کیا ہے:

> محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ کیوں محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے اس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

> اے میرن صاحب! السلام علیکم، حضرت، آداب۔ کہو صاحب! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور، میں کیا منع کرتا ہوں، مگر میں اپنے خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟ نہیں، میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔
>
> جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے کیا خفا ہوں گے۔ بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟ کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا۔ تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ! میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لَاحَولَ ولَاقُوۃ۔

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مقصد لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیان سے واقف نہیں، وہ اس کو مکتوب الیہ کا

غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں:

> میر مہدی! جیتے رہو، آفرین صد ہزار آفرین! اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو، دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں، کیوں کہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں، وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے، ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا‘‘ اسی قدر ان کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہِ کسرِ نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں، ان میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں، جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا ان کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا، اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ ان کے نام کی علامت لکھتے ہیں، مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے، اور جواب کیا۔ شاید قصے اور ناول میں یہ بات نہ چل سکے، مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، وہ شوخیِ تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں

مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی، جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے، اُس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی، جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثرِ اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے: علمی، اخلاقی، پولیٹکل، سوشل اور ریلیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت عمدہ لکھی گئی ہیں؛ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً ایک اپنے دوست کو خط لکھا ہے۔ اُس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں ان کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:

> کیوں بھئی اب ہم اگر وہاں آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارو ہیں، ان کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:

> اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب! پہلے اس خطاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پتلی۔ چشمِ جہاں بین تمھارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم ہو۔ بیٹے! دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں، میں تو صرف تمھارا دلدادہ ہوں۔

لطیفہ ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں:

> دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہیں اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن

جواب لکھا ہے۔

شوخی ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا، اُس میں لکھتے ہیں:

> دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

جس زمانے میں "برہان قاطع" پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی مخالفت اور مؤلفِ برہان کی حمایت کی ہے۔ ایک خط میں صاحبِ برہان کا ذکر کرنے کے بعد اس کی اور اس کے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں:

> ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے: جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ ہاں نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مستند جانیں۔ ایک گائے کا بچہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔

لطیفہ ایک خط کے آخر میں جو نواب علاء الدین خان کو لکھا ہے، لکھتے ہیں۔

> استاد میر جان کو اس بات سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھی، اور یہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، دعا، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کوئی حسن و مال کی بات نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی؛ اور اس نظر سے کہ سید ہیں، درود، اور بموافق مضمون اس مصرع کے سوی اللہ واللہ ما فی الوجود، سجود۔

ایک خط میں برسات کا ذکر کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

> دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔

نواب علاء الدین خان اور ان کے والد نواب امین الدین خان میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا، نواب علاء الدین خان کو خط میں لکھتے ہیں:

ادا ہو گیا۔ مستغرق رہا خیر رہو۔ صبح کی تبریزات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔ چوں کہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحال پوچھی تھی ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا

اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدام ما

دیکھا ہم کو یوں بلاتے ہیں۔ دریبہ کے بنیا کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائلِ ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقہ وحدتِ وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحدِ خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام!

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اس میں جلیں...... سنو مولوی صاحب! تم نے کس ذوق میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو

اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے! مجموعۂ نثر جداگانہ۔ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔

ایک خط میں تعلقاتِ خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں:

> سنو، عالم دو ہیں۔ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار"۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا)۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہِ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا:
>
> فرخ آں روز کہ ازیں زنداں بروم
> سوی شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چُنّا جان کی تعزیت میں لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

> آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور

فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے؛ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے؛ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر میں ایک .... کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑو۔

سعدی! اگر عاشقی کنی و جوانی　　عشقِ محمدؐ بس ست و آلِ محمدؐ

اللہ بس ماسوا ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چُنا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے:

> مرزا صاحب: ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ: مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی! کہاں کی مرثیہ خوانی! آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو، تو چنّا جان نہ سہی، مُنّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے؛ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے، وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست! ہر نوبہار   کہ تقویمِ پارینہ ناید بہ کار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے، اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں:

> حلیہ مبارک نظر افروز ہوا...... تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے، تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے، وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری! بقول شیخ علی حزیں ؎
>
> تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم
>
> جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا۔

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں، یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں:

> بھائی صاحب! میں بھی تمھارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے، تین پھوپھیاں اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی، اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں:

آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں:

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر! کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ، خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں: اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، او غلام صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو! بولے کیا بے حیا، بے عزت! کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہوگیا ہے اس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں:

صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ محبت درپیش آئے: شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا، اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم

منشی ہرگوپال وتخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام بھی دلی اور اُس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے؛ لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں، تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

ایک خط میں نواب علاء الدین خان کو لکھتے ہیں:

کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو؛ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے؛ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے؛ وہ دلی نہیں ہے، جس میں میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں؛ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں؛ ایک کمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں ـــ امرائے اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خان بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامراد مر گیا میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خان کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا ـــ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مر گیا؛ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں؛ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؛ جو حکما کا حال کل لکھا ہے، وہ بیان واقع ہے، صلحا و زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے، جس سے ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک

خط میں لکھتے ہیں:

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفرِ دور دراز درپیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخِ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے، باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا، اور گمنام جیے تو کیا! کچھ معاش ہو، کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یارِ جانی! ہرچند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بیرنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابقِ سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے؛ ہستی نہیں ہے، پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں، مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا۔

مرزا نے بعض اردو خطوں میں اور خاص کر اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفاتِ باردہ میں شمار کیا جاتا ہے، خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے، وہ اس قسم کے تصنّع اور ساختگی کی متحمّل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجّع عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے، اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجّع نثر میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے، تو اس میں تصنّع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا

فقرہ بہ سبب لزوم مایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے؛ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطفِ طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ معلوم رہے کہ مقفّیٰ عبارت مرزا خاص کر ان خطوں میں لکھتے تھے، جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا؛ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سید یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں:

> یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ! بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا! صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا، یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔

انھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں:

> اے میری جان، اے میری آنکھوں کے نور!
>
> زہجرانِ طفلے کہ در خاک رفت
> چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت
>
> وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو؛ خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت۔ نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؛ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے! ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملہ واقعاتِ کربلا ہے

مطلے ہے، یہ دانہ جیسے بن ٹے گا

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے، وہ بغیر ان تکلفاتِ باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے، اُس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

بایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں، خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب "سراج المعرفۃ" پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں، اُس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصو[illegible] اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی ۔ ۔

کتاب "سراج المعرفۃ" جس پر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے، اس میں مفتی میر لال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و اذکار، جو آنحضرتؐ کے زمانے سے اس وقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے، ایک جگہ جمع کیے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفتِ الٰہی میں کیا دخل ہے اور کیوں کر ان کے ذریعے سے توحیدِ وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ دیباچۂ مذکور کا اول و آخر کا حصہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورۂ بالا مقصد کو بیان کیا ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مرزا لکھتے ہیں کہ..

> حق یوں ہے کہ حقیقت ازروئے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پہ لکھا ہے لا موثر فی الوجود الا اللہ، اور خط میں مندرج ہے لا موجود الا اللہ، اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اس معنیِ غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتبِ توحید چار ہیں، آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علیٰ نبینا وعلیہم

اعلانِ مدارجِ سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجابِ تعیناتِ اعتباری اٹھا دیں اور حقیقتِ بیرنگیِ ذات کو صورتِ الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواصِ امتِ محمدی کا سینہ ہے اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مفتاحِ بابِ گنجینہ ہے۔ رہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفیِ شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفیِ شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے، ان کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے، اسی توحیدِ ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے، جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے، شفاعتِ محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃٌ للعالمین ہونے کے؛ اور اسی مقام سے ناشی ہے نغمے روح افزائے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ؛

قلم اگرچہ دیکھنے میں دوزبان ہے، لیکن وحدتِ حقیقی کا راز دان ہے۔ گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذوجہتین ہے، ایک جہتِ خالق کہ جس سے اخذِ فیض کرتا ہے اور ایک جہتِ خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ است دلجوئے خلق   یکے سوئے خالق، یکے سوئے خلق
بداں وجہ، از حق بود مستفیض   بدیں وجہ، بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضلُ من النبوۃ" معنی اس کے صاف اور ازروئے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے، افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے، نہ یہ کہ ولایتِ عام افضل ہے نبوتِ خاص سے۔

جس طرح نبی مستفیض ہے حضرتِ الوہیت سے، اسی طرح ولی مستنیر ہے انوارِ نبوت سے۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقولی اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھی، نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی، مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃِ نبوت سے، ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور یہ سراجِ ایزدی تا صبحِ ظہورِ قیامت روشن رہے گا[1] اور اب اسی کا نام ولایت[2] اور یہی شعلِ طریقِ ہدایت ہے۔ ولایت و ہدایت وہی حقیقتِ توحیدِ ذاتی ہے کہ جو از روئے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مشہودِ عیونِ اعیانِ امت اور منظورِ نظرِ اکابرِ ملت ہوئی ہے۔

مگر وہ بات اب کہاں کہ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہے اور دل نورِ معرفت سے منور ہو جائے؛ اور وہ مضامین زبردست کہاں کہ قائل لا الٰہ الا اللہ کو اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو، قدرتگاہ توحید پر قائم کر دے، یعنی رسولِ مقبولؐ واجب التعظیم قائلِ انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم۔ اب سعادت بقدرِ ارادت ہے اور راحت بقدرِ جراحت۔ پیچ بھی تو ہے۔ آدمی کیوں کر سمجھ سکے اور بطلانِ بدیہیات کے جواز پر اُس کو کیونکر تسلی ہو یعنی اس مجموعۂ موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں، نیست و نابودِ محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے

اے کردہ بہ آرائشِ گفتار بسیچ — در زلفِ سخن کشودہ ای خم و پیچ
عالم کہ تو چیزِ دیگرش می دانی — ذاتیست بسیطِ منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوسِ بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب استیلائے وہم کے مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہے جاتے ہیں، ہر چند ان کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے، ناچار اشغال و اذکار وضع کیے؛ تا قوتِ متخیلہ اس میں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جائے۔ وحدتِ وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اس کو بجبر یا بتکلف ثابت کیا چاہتے ہوں

دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا، بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بے خبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے، اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آ گئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدتِ وجود کو سمجھ لیں، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں؛ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالتِ بیخودی کے واسطے محتاجِ اشغال و اذکار ہیں، بہت ہیں، بلکہ بے شمار ہیں۔

یادگارِ غالب

(حصہ فارسی)

ترتیب

حصّہ دوم — فارسی

نظم و نثرِ فارسی
انتخابِ غزلیاتِ فارسی
رُباعیات

قصائد

توحید
مرثیہ و نوحہ
قصیدۂ فخریہ۔ ستایشِ روزگار
صفتِ سالکانِ طریقت
صفتِ موسمِ بہار
کیفیتِ آغازِ موسمِ سرما
صفتِ موسمِ بہار
کیفیتِ صبح
بندِ اوّل
از بندِ سوم
از بندِ چہارم
قطعات
بندِ اوّل
بندِ دوم
بندِ سوم
بندِ چہارم

قطعاتِ فارسی

بندِ پنجم
بندِ ششم
بندِ ہفتم

نثرِ فارسی

نثرِ فارسی کے نمونے
فخریہ فقرے
طرزِ واقعہ نگاری
پارہ از احوالِ امیر تیمور
پارہ از احوالِ ہمایوں و شیر شاہ
از دستنبوہ۔ غدر کے اسباب
کیفیتِ شورشِ باغیان در دہلی
از دیباچۂ ثانی درفشِ کاویانی
از تقریظات دیباچہ ہائے
از دیباچۂ دیوانِ فارسی

ازخاتمۂ دیوانِ فارسی
ازدیباچۂ دیوانِ تفتہ

انتخاب ازمکاتبات

شیخ علی حزیں اور مرزا کے
طرزِ بیان کا مقابلہ
مرزا اور ابوالفضل کی طرزِ بیان
کا مقابلہ
خاتمہ

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم بہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ انھوں نے حاصل کیا تھا، اُس کو اِس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے، جب کہ اس زمانے میں بہت سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے، مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدری کی شکایت کرتے تھے، تو اب کیا امید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو ان کی قدر جتائی جا سکے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے، تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ان کے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونہ کے پبلک کے سامنے پیش کر دیں، اور چوں کہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے، اس لیے جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی، سمجھ دار آدمی اس کا کسی قدر اندازہ کر سکیں، لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جس کے نقاد اور جوہری ملک میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ اس کی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے:

بیاورید، گر اینجا بود زبان دانے غریبِ شہر سخن ہاے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر گُر مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے، جو ان کا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔ اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو، خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی، جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلم الثبوت استاد کو ہونی چاہیے، لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے، اسی طرح مرزا بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تصوف

حبِ اہلبیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بے باکی، بیانِ رنج و مصیبت و شکایت و زار نالی، اظہارِ محبت و ہمدردی، حسنِ طلب — یہ چند میدان ایسے تھے، جن کا بیان مرزا کے تمام اصنافِ سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح و مرقّع واقع ہوا ہے۔ بے شک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی کیوں کہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ابا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا اصنافِ کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الا ماشاء اللہ) اسی لیے ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے، عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے مؤثر اور دل آویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو، دلوں میں گھر نہیں کر سکتا، مگر اس سے مرزا کی استادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ "ایں شیوہ ختم است بر دیگراں" اور اس کا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا اور باایں ہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا، تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے ان کی استادی میں کیوں کر فرق آسکتا ہے! یہ میزان جو ہم نے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے، اس کو ان کے کلیاتِ نظم و نثر میں جانچنا چاہیے، نہ انتخابی اشعار میں، جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا، جس کا زمانے میں کوئی قدر دان نہ تھا۔ ان کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ و سلاطین و امرا و رؤسا تھے، جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی، نہ ضرورت۔ وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے

ٹکر کھائے، جس کی غزل عرفیِ و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے، جو رباعی میں عمرِ خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں، اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا، اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔ گورنمنٹ کے ارکان و اعیان کی مدح کے صلے میں مرزا کو اس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا، جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلاشبہ ملک میں بے شمار تھے، مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور ان کی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جب کہ ممدوحوں کی قدر دانی کا وہ حال ہو، اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ، نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے؛ بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں، جو خواہی نخواہی اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں؛ اولاً سبقِ استعداد اور فطری قابلیت جس کا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدر دان یا مخاطبِ صحیح نہ ہو، تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں، اس کو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں، اسی طرح وہ شاعر، جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے، بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اس کی قدر کرے، یا اس کے کمال کی داد دے، اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقت سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمرِ طبیعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی، مگر حُسنِ اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دار الخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں

سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدر الدین خان متخلص بہ آزردہ، مولوی عبداللہ خان علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خان مومن، نواب مصطفیٰ خان حسرتی، نواب ضیاالدین احمد خان نیر، سید غلام علی خان وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا اُن کی شاعری کے حق میں بعینہٖ ایسا تھا، جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہراً مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن چوں کہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے، اس لیے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا، اسی طرح نکتہ چینوں کے خیال سے ان کو پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا، اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی، اور اس طرح قدر دان اور نکتہ چین دونوں ان کی ترقی کا باعث تھے۔

لطیفہ مولانا فضل حق باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے، اس کا اندازہ حکایتِ ذیل سے ہو سکتا ہے:

مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ اُنھوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اُس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا: "آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں، آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے۔" اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اُس کے معنی کہے تھے، بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا: "پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟" اس نے کہا: "برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو، مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔" مولانا نے کہا: "اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے، جو مرزا نے سمجھے ہیں، تو اس نے سخت غلطی کی۔"

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے، اور وہ مقطع یہ ہے:

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری، غالب! گر ترقی نہ کنم، شیخ علی را مانی

مومن خان مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سُنا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ

اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے؛ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ ایک صاحب نے جو مومن خان مرحوم کی تعلّیوں سے خوب واقف تھے، یہ حکایت سُن کر کہا کہ مومن خان نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے، ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مُصطفےٰ خان مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو بمراتب برتر و بالا سمجھتے تھے۔ نواب ضیاءالدین خان کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترکِ لاچین (یعنی امیر خسروؒ) سے ہوئی اور ایک ترکِ ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی خان وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا، تو عربی شعر میں دوسرا متنبّی یا ابوتمام ہوتا اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا، تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرزِ خاص کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی، ناپسند کرتے تھے؛ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہو گیا تھا، وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چناں چہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے، اُس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا ان کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایتِ روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں:

با چنیں اندہ کہ سر گفتیم و دل خالی نشد — خواجہ گر اندہ گسارِ من نبودے، واے من!
آنکہ در یکتائیِ وے در فنِ فرزانگی — متفق گردیدہ رائے بوعلی با رائے من
آنکہ چون خواہد بنامش نامہ نامی ساختن — برنگارد عقلِ فعالش "کرم فرمائے من"
دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنیم — آنکہ ننگِ اوست بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاقِ رائے کرنا اور عقلِ فعال کا اس کو "کرم فرمائے من" لکھنا یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں؛

مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اس کے واسطے موجبِ ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف، ایک نہایت لطیف پیرایے میں بیان کی ہے، اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جب کہ راقم بھی موجود تھا، آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی، فارسی دیوانِ غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی، جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے:

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست   فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا: "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل کہی ہے۔" یہ کہہ کر غزل پڑھنی شروع کی۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر، جیسی ان کی عادت تھی، کہنے لگے: "کلام مربوط ہے، مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی، مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا:

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی   مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔

صہبائی اور علوی بھی چوں کہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا، اس لیے وہ مرزا کو اور مرزا ان کو کم مانتے تھے۔ لیکن چوں کہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مڈبھیڑ رہتی تھی، مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی؛ اور یہی ان کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اوّل مرزا بیدل وغیرہ کی طرز

میں کہنی شروع کی تھی۔ چنان چہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے دیوانِ فارسی کے خاتمے میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے

> اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا، جو راہِ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رو تھے، دیکھا کہ میں باوجودے کہ اُن کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر "مربیانہ" نگاہ ڈال۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی؛ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا؛ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اُس گروہِ والاشکوہ کے فیضِ تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار؛ جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر ان کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزل میں نہ صرف نظیری، بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے، ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن طرزِ بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں، جن میں عنصری سے لے کر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سربرآوردہ ہوا ہے اس کا نام لیا ہے۔ ان کے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی۔ چوں کہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

ناظم کہتا ہے:

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن　　شدہ عنصری شاہِ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی　　بہ فردوسی آمد کلاہِ رہی
چو فردوسی آورد سر در کفن　　بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گذشت　　نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل در کشید　　سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگِ سعدی فرو شد زکار　　سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید　　ز جامی سخن را تمامی رسید

اس کے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی، اس کو مرزا نے یوں پورا کیا ہے:

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید　　ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

اگرچہ مرزا نے بیدل اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے تھے، مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخرکار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس مقام پر ان کی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کریں گے جن کے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور ان کے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخابِ غزلیاتِ فارسی

توحید

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری　　طرۂ پرخم صفات موی میاں ماسوا

یعنی اگر تیرے حُسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے، تو اس کا طرۂ پرخم کیا ہوگا؟ صفاتِ الٰہی، اور اس کا موے میاں کیا قرار پائے گا؟ ماسوی اللہ۔ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور چوں کہ ماسوی اللہ کو صوفیہ معدومِ محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں، اس لیے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوی

کو قرار دیا ہے۔

توحید

آب نہ بخشی بزورِ، خونِ سکندر ہدر   جاں نہ پذیری بہ ہیچ، نقدِ خضر ناروا

ہدر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیوان کی تلاش میں گیا تھا، مگر ناکام رہا۔

کہتا ہے کہ تو زورِ حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا۔ پس اگر سکندر آبِ حیوان کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے تو ہو۔ دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے، مگر تو اس کو قبول نہیں کرتا اور اس لیے اس کو کسی طرح موت نہیں آتی۔

توحید

بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب   سازِ ترا زیر و بم، واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں، جو سب سے زیادہ نشانۂ مصائب و حوادث و آلام ہیں۔

توحید

سادہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ام   مستیِ ما پائدار، بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا، نہ پینا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویا میں نے شرابِ کا ایک قطرہ نہیں پیا، مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں؛ یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا، مگر تیری محبت میں سرشار ہوں۔

قطعہ

توحید

اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب   کز فیضِ تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را
تا نامِ تو شیرینیِ جاں دادہ بہ گفتن   درخویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آں حضرت کا نامِ مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے اس کو اپنے اندر اتار لیا۔

فخریہ

ما ہمائے گرم پروازیم، فیض از ما مجوے   سایہ ہمچوں دود، بالا می رود از بالِ ما

یعنی ہماری پرواز میں اسی قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی اوپر جاتا ہے، اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

شوخی

حالِ ما از غیر می پرسی و منت می بریم
آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے، ہم اسی بات کے شکر گزار ہیں۔ غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھ کو ہمارے حال کی خبر نہیں

امّید

دلِ مایوس را تسکیں بہ بردن می تواں دادن
چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

تصوّف

خطے بر ہستیِ عالم کشیدیم، از مژہ بستن
ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بُردیم دنیا را

عاشقانہ

وقفِ تاراجِ غمِ تست، چہ پیدا، چہ نہاں
ہمچو رنگ از رُخِ ما رفت دل از سینۂ ما
جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد خلد
لبِ لعلِ تو ہم این ست و ہم آن ست مرا

فخریہ

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منّتے بر قدمِ راہ رواں ست مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ میں نے ان کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے، وہ سب میں نے اس طریقے پر چل کر دور کر دیے ہیں اور آئندہ آنے والوں کے لیے راہ صاف کر دی ہے۔

تمثیلِ حالاتِ خود

رہروِ تفتہ، در رفتہ بہ آبم غالب
توشہ بر لبِ جُو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اُس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لُو سے جلا بھنا پانی کو دیکھ کر بے اختیار اس میں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے پر اس کا زادِ راہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی

خاص حالت کو تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھ کو محض اٹکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں، سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

دُنیا

سایہ و چشمہ بصحرا دمِ عیشے دارد　　اگر اندیشۂ منزل نبود رہزنِ ما

یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے، اس لیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

زار نالی

می پرد مور، مگر جاں بسلامت ببرد　　تا چہ برق ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہمارے خرمن پر کونسی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے کے لیے پہلے ہی سے اڑے جاتے ہیں۔ تمثیل کے پیرایے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

فخریہ

سخنِ ما ز لطافت نپذیرد تحریر　　نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آ سکتے، گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اُٹھتا۔

فخریہ

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی، غالبؔ!　　شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہم کو مجبور کیا کہ ہم اس کو اپنا فن قرار دیں۔

شکایت

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند　　خود را بزور بر تو نگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوندِ حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کی جاتی ہے۔

فخریہ

بروئے حاسداں درِ دوزخ کشودہ رشک　　از بہرِ خویش جنتِ در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھ کر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لیے جنتِ دربستہ ہیں۔ پس چوں کہ ہماری جنت کی کیفیت سے اور جو اس میں لذت و راحت ہے اس سے، حاسد لوگ بے خبر ہیں اس لیے رشک سے ان کی یہ حالت ہے کہ گویا ان پر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

تصوف

سوزِ ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت   از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے؛ اور ذرہ برابر کسی کے لیے اس میں سے حصہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغدار قرار دیتے ہیں در حقیقت اس پر تہمت رکھتے ہیں۔

عاشقانہ

با چوں توئے معاملہ بر خویش منت است
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

زار نالی

روے سیاہِ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم   شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

رندانہ

کدوے چوں زمے یابم، چناں بر خویشتن بالم
کہ پندارم سر آمد روزگارِ بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھ کو مل جاتا ہے، تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس، اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

رندانہ

سخن کوتہ، مرا ہم دل بتقویٰ مائل ست، امّا
زننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے، اس لیے میری کفار کی سی حالت ہے، ورنہ تقویٰ کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

اخلاق

در شربِ حریفاں منع است خودنمائی   بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے، جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ؛ اور لفظی معنی

اس کے ہم پیشہ ہیں۔ جب شراب خوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اس سے مراد شراب خوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم شراب خواروں کے مشرب میں خودنمائی منع ہے۔ دیکھو، جمشید، جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے، اس کے ہاں آلۂ خودنمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا، نہ تھا۔

شوخی

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی
بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا

یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا ہے تو اس کا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ، کیوں کہ عہدِ وفا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے، وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

عاشقانہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے۔ پس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار بار نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے کیوں کہ شاعر باوجودے کہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے، مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا، اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

متصوفانہ

رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار و غرور کا رواج ہے، وہاں ہرگز نہ جا، اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے، وہ مستی ہے، یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرفِ عالی لے کر آنا چاہیے۔ مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا اس میں جو لطف ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

رشک

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگزارد کہ گویم نام را

زار حالی

کشتہ در تاریکیِ روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اس کی تاریکی دونوں مل گئیں اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

خلوص

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود   خوش بود گر دانہ نبود دام را

وہی مضمون ہے جو مرزا نے اُردو میں اس طرح باندھا ہے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو   شوق نشناسد ہمی ہنگام را

عاشقانہ

در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را   مہتاب کفِ مارِ سیاہ ست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامانِ عیش و طرب مہیا ہوتا ہے، اس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے، وہ میری رات کے حق میں مارِ سیاہ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

غیرت

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم   گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں، لیکن اگر دریا کی موج پر مجھ کو یہ شبہہ بھی گزرے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحلِ دریا پر جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

عاشقانہ

بپایانِ محبت یاد می آرم زمانے را   کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے کہ اب انتہائے محبت میں جب کہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم و بے وفائی کی کچھ حد نہیں رہی، مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے اس کو دل دیا تھا اس وقت وفاداری کا تعہد نہ لے لیا۔ حالاں کہ دل کا دینا کوئی اختیاری بات نہیں ہے کہ جس طرح بیع و شرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں، اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لی جاتی۔

رندانہ

آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند است   از شب روی ماست شکوہِ عسسِ ما

شب روی: چوری کے لیے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دی جائے

تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکبِ جرائم ہوتے ہیں، گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

زارنالی

وقت است کہ خونِ جگر از درد بجوشد
چندانکہ چکد از مژۂ دادرسِ ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خونِ جگر درد سے اس قدر اُبلے کہ حاکمِ دادرس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

آزادی

در دہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود
بر قند، نہ بر شہد نشیند مگسِ ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں، مگر ان میں پھنستے نہیں۔ جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اڑ گئی، نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

رندانہ

بادۂ مشکبوی ما، بید و کنارِ کشتِ ما
کوثر و سلسبیلِ ما، طوبیِ ما، بہشتِ ما

عاشقانہ

حسرتِ وصل از چہ رُو، چوں بخیال سرخوشیم
ابر اگر بایستد، بر لبِ جُوست کشتِ ما

یعنی جب کہ ہم خیالِ دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے، ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

رندانہ

بردہ صدرالعین لبسرا بر سرِ صد ہزار خُم
گر نہی در آفتاب، بادہ چکد ز خشتِ ما

بادہ اگر بود حرام، بذلہ خلافِ شرع نیست
دل نہ نہی بہ خوبِ ما، طعنہ مزن بزشتِ ما

زہاد کی طرف خطاب ہے جو شراب خوری اور رندانہ بذلہ سنجی دونوں کو بُرا سمجھتے ہیں، کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلافِ شرع نہیں ہے؛ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنیٰ درجے کی چیز ہے، اس پر تو طعن مت کر۔

تضمین مصرعِ طرح

گفت بحکمِ حسرتی غالبِ خستہ ایں غزل
"شاد بہیچ می شود، طبعِ وفا سرشتِ ما"

یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب کہ نواب مصطفےٰ خان مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، صہبائی، آزردہ، مومن اور نیر وغیرہم سب

اس میں شریک ہوتے تھے۔ اس مقطع میں مرزا نے مصرعِ طرح کو تضمین کیا ہے۔ اب اس کے یہ معنی ہوگئے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمایش کی گئی، ہماری طبعِ وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔

عاشقانہ

مُردم زفرطِ ذوق و تسلی نمی شوم   یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا ہے کہ اس کی تعریف کرتا کرتا مر گیا اور پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ الٰہی! اس لبِ خنجر ستا کو کہاں لے جاؤں کہ جہاں جا کر تسلی ہو۔

رندانہ

شبم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا   ہلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہے را

پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شبِ تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برقِ شراب کی چمک پر، جو کبھی کبھی چمک جاتی ہے اور اس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آجاتی ہے۔ مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی مل جاتی ہے، صرف اس کی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

رندانہ

مے باندازہ حرام آمدہ، ساقی! برخیز   شیشہ خود بشکن بر سرِ پیمانہ ما

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی، شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے، تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔ اس شعر میں افراطِ شوق کی تصویر کھینچی ہے، خواہ کسی چیز کا شوق ہو۔ جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اس کی خواہش کی جائے۔ جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے، تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں۔ پس گو کہ مضمونِ شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

زارنالی

مو برآید زکفِ دست اگر دہقاں را   نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتھیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی۔ کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتھیلی میں بال بھی نکل آئیں، تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُس

میں سے ریشہ نکل آئے، یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

تصوف

خرابیم و رضایش در خرابیہاے ما باشد　　ز چشم بد نگہ دارد خدا ما دوست کاماں را

خراب، مست، ویران اور تباہ تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جس کی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو، یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں۔ پس ہم دوست کاموں کو جن کی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے۔

مناجات

بسا افتادہ سرمست و بسا افتادۂ در طاعت　　تو دانی تا بلطف از خاک برداری کداماں را

تصوف

عالم آئینۂ راز است، چہ پیدا، چہ نہاں　　تابِ اندیشہ نداری، بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا، تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کر اس کا ظاہر و باطن سب مظہرِ اسرارِ الٰہی ہے۔

تصوف

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار　　نیست گر صبح بہاری، شبِ ماہے دریاب

شوخی

گر پس از جور بہ انصاف گراید، چہ عجب　　از حیا رُوے بما گر ننماید، چہ عجب!

کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے جرم یاد کر کے حیا سے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو تعجب نہیں۔ مطلب یہ کہ انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کرے گا کہ ہم اس کے دیکھنے سے محروم رہیں

شوخی

بودش از شکوہ خطر، ورنہ سری داشت بمن　　بمزارم اگر از مہر بیاید، چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

معذرت

باچنیں شرم کہ از ہستیِ خویشش باشد　　غالب ار رخ بہ رہِ دوست نساید چہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے، اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ عجب نہیں۔

غزل نعتیہ

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است   آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است
آئینہ دارِ پرتوِ مہرست ماہتاب   شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است   اما کشادِ آن ز کمانِ محمدؐ است
دانی اگر، بہ معنیِ لولاک وا رسی   خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است
ہر کس قسم، بدانچہ عزیز است، می خورد   سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است
واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگزار   کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را   کان نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است
غالب! ثنای خواجہ بہ یزدان گذاشتیم   کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

یہ غزل مرزا کے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چوں کہ وہ تخمیس اب تک شایع نہیں ہوئی، اس لیے مقتضاے مقام یہ ہے کہ اس کو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کر دیا جائے،

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است   عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است
گر نور و گر ہدیٰ کہ ازانِ محمدؐ است   "حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است"
"آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است"

دانی ز پیشِ چشمِ تو برخیزد ار حجاب   کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب
باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب   "آئینہ دارِ پرتوِ مہرست ماہتاب"
"شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است"

لطفِ خداست، گر بسرِ کس نہاد دست   قہرِ خداست، چوں ز سرِ کین بجملہ جست
دلند کسیکہ شد زمئے نا رسیدہ مست   "تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است"
"اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ است"

گوئی، اگر بعالمِ ادراک وا رسی   بینی، اگر بدیدۂ دراک وا رسی
سنجی، اگر بمرتبۂ خاک وا رسی   "دانی، اگر بمعنیِ لولاک وا رسی"
"خود ہر چہ از حق است، ازانِ محمدؐ است"

شاہد بقتلِ عاشق و عاشق بخال و خد   مجنوں بپاے لیلی و لیلیٰ بہ فرقِ خود

مومن بہ آلِ احمد و آلش بروحِ جد　　"ہر کس قسم بدانچہ عزیزست، می خورد"
"سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است"

اے خامہ بوصفِ قامتِ معشوق کم نگار　　اے دل! سخن ز راست قداں درمیاں میار
قمری! ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار　　"واعظ! حدیثِ سایۂ طوبی فروگزار"
"کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است"

حکمش بمہر و ماہ روانست چوں قضا　　دیدی کہ بازگشتنِ خورشید بر قضا
بودہ است بر اشارۂ ابروے مصطفیٰ　　"بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را"
"کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است"

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود　　وز آل و از صحابۂ امت سخن رود
واں کاینہمہ ز ختمِ رسالت سخن رود　　"وز خود ز نقشِ مُہرِ نبوت سخن رود"
"آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است"

ہمت بمدحِ شہ من دعالی گماشتیم　　گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کام و لب فراخورِ وصفش نداشتیم　　"غالب! ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم"
"کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است"

شوخی

بیخود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من　　وابستہ دشنہ نیز نہ کردن گناہِ کیست؟

یاد از عدو نیارم و اینہم ز دور بینی ست　　کاندر دلم گذشتن، با دوست ہمنشینی ست

کہتا ہے، میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا، یہ دور بینی کی بات ہے کیوں کہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے؛ اگر رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشین ہو جائے گا۔

شوخی

من سُوے او بہ بینم، داند ز بیحیائی ست　　اُو سُوے من نہ بیند، دانم ز شرمگینی ست

عاشقانہ

چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ کمانِ تو نیست　　قیامت ست! دل دبر مہربانِ تو نیست
رواں فدائے تو! نامے کہ بردہ ناصح!　　زہے لطافتِ ذوقیکہ در بیانِ تو نیست!

چوں کہ ناصح ترکِ عشق کی نصیحت کرتا ہے، اس لیے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر قربان ہو، تو نے کس کا نام لیا ہے؟ وہ کیسی لطافت اور لذّت ہوگی، جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے؟ یعنی جس طرح اس کا نام لینا چاہیے تھا اگر اس طرح تو بھی وہ نام لیتا، تو کیسی لطافت اور لذّت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چوں کہ ناصح نے بُری طرح سے اس کا نام لیا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

عاشقانہ

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چراست　　　چہ گفتہ‌ٔ بہ زبانے کہ در دہانِ تو نیست

معشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی نگاہ یا تبسّم یا کسی اور ادا سے اس کے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے۔ پس کہتا ہے کہ تیرے لعلِ لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے؟ تو نے اُس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے جس سے اس کو امید بندھی ہے۔

عاشقانہ

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی　　　بداست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

اخلاق

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست　　　قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو الٹا ہے۔ اُس نے اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے، جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے، یوں کہا تھا:

روی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چناں چہ دریا میں انسان جب ہی تک بے چین رہتا ہے جب تک ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب ڈوب گیا، پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ

قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست

شوخی

پاک خور امروز و زنہار از پے فردا منہ   در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شرابِ طہور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے، وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے، اُس کو کل کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس ان سے کہتا ہے کہ "پاک خور امروز" یعنی سب آج ہی نبیڑ دے، اور کل کے لیے مت رکھ، کیوں کہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے، اور کل وہی آگ ہو جاوے گی

تصوف

ز وہم نقشِ خیالی کشیدۂ ورنہ   وجودِ خلق چو عنقا بدہر نایاب است
قوی فتادہ چو نسبت، ادب مجو، غالب!   ندیدۂ کہ سوی قبلہ پشتِ محراب است!

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے، تو پھر آدابِ ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ دیکھو قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لیے خلافِ ادب ہے، مگر محرابِ مسجد جس کو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ہے، اس کی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے۔

شوخی

ہر چہ فلک نخواستہ است، ہیچکس از فلک نخواست
ظرفِ فقیہ مے نہ جُست، بادۂ ما گزک نخواست

تصوف

بحث و جدل بجای ماں، میکدہ جوی کاندراں
کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نخواست

بجاے ماں بمعنی بجاے دار یعنی بحث و جدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جا کہ وہاں نہ جمل کا جھگڑا ہے، نہ فدک کا قصہ ہے۔ جمل سے مراد جنگِ جمل ہے، جس میں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجور کا باغ تھا، جس پر حضرت [illegible] النسا فاطمہ زہرا نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ دونوں جھگڑے منجملہ ان بے شمار نزاعوں کے ہیں جن پر سُنّی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

فخریہ

دل جلوہ مید ہد ہنر خود در انجمن   رحمے مگر بجانِ حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا، حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا؛ اب علی الاعلان اپنے

ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں۔ گویا اب حاسدوں کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

بے دماغی

غالب زباں بریدہ و آگندہ گوش نیست
اما دماغِ گفت و شنودش نماندہ است

عاشقانہ

بلبل! دلت بنالۂ خونیں بہ بند نیست
آسودہ زی کہ یارِ تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل! تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے؛ جب چاہتی ہے، نالہ کرتی ہے۔ پس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گُل مشکل پسند نہیں ہے، بخلاف ہمارے کہ ہم کو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے، حال آنکہ نالۂ خونیں نے دل بھرا ہوا ہے۔

تصوف

بیخود بزیرِ سایۂ طوبیٰ غنودہ اند
شبگیر رہروانِ تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں، ان کا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے، ان کا منتہائے مقصود طوبیٰ کے سایہ میں آرام کرنا ہے۔

شکایتِ سخن

اختری خوشتر از نیم بجہاں می بایست
خردِ پیر مرا بختِ جواں می بایست

فخریہ

تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نہ شود
نرخِ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

فخریہ

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست
گفتند اندریں کہ تو گفتی، سخن بسی ست
مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بہ ہیچ دشت
در مرغزارہائے خطا و ختن بسی ست
در صفحہ نبودم، ہمہ آں چہ در دل ست
در بزم کمتر است گل و در چمن بسی ست

رندانہ

دراز دستیِ من چاک ار فگند چہ عیب!
ز پیش دلقِ ورع با ہزار پیوند است

نگفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر
بروکہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

عاشقانہ

اگر نہ بہرِ من، از بہرِ خود عزیزم دار   کہ بندہ، خوبیِ اُو خوبیِ خداوند ست

تصوف

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم   با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

یعنی ہم کو آگے جانے کی جلدی ہے۔ ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔

تصوف

آں راز کہ در سینہ نہانست، نہ وعظ ست   بردار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

شوخی

کارے عجیب افتاد بدیں شیفتہ مارا   مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

رندانہ

گفتم، زکہ پُرسم اثرِ عمرِ گزشتہ   ساقی بہ قدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

شوخی

در قالبِ مُلّا اثرش پردہ کش شُد   خاکے کہ قضا در تنِ گوسالہ فرو ریخت

دوستی

گر منافق، وصل ناخوش؛ ور موافق، ہجر تلخ
دیدہ داغم کرد رُوے دوستاں دیدن نداشت

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور ان سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیے تھا کیوں کہ جو منافق ہیں ان کا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں، ان کی جدائی تلخ ہے۔

انسان

بُرد آدم از امانت ہرچہ گردوں بر نتافت   ریخت مے برخاک، چوں در جام گنجیدن نداشت

یعنی بارِ امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اٹھ سکا وہ انسان نے اٹھا لیا۔ گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیے اور جام آسمان کے لیے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بارِ امانت جو انسان پر ڈالا گیا تھا اس کی تشبیہ اس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے، کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے۔

تصوف

قفس و دام را گناہے نیست   ریختن در نہادِ بال و پر ست

نہاد، جبلت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونوں جانور کے لیے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں، جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اور اس کے بال و پر گر جاتے ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اس کی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے، بال و پر گرنے ہی کے لیے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

تصوف

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند   ہم خزاں ہم بہار در گذر است

یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں؛ اُس میں پتے جھڑتے ہیں، تو اس میں پھول جھڑتے ہیں۔

عاشقانہ

بے تو گر زیستہ ام سختیِ ایں درد بسنج   بگذر از مرگ کہ وابستۂ ہنگامے ہست

یعنی موت کے لیے تو ایک وقت معین ہے، اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں، بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیوں کر رہا اور کیوں کر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

رندانہ

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم بخشد   در گروگاں طلبد، جامۂ احرامے ہست

رطل، پیمانہ، شراب۔ نبیذ، شراب۔ گروگان، وہ شے جس کو گرو رکھیں۔ جامۂ احرام، وہ بن سلا کپڑا جو مناسکِ حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

عاشقانہ

نہ بدر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد   سوختم، لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد، راکھ۔ پہلا سوختم، لازمی۔ دوسرا سوختم، متعدی۔ کہتا ہے، میں جل تو ضرور گیا، مگر معلوم نہیں اس نے کس طرح مجھے جلا دیا، نہ کوئی پتنگا اڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

عاشقانہ

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام   داند کہ حور و کوثر و دارالسلام چیست

دوست کو حور سے، بادہ کو کوثر سے، اور خلوت کو دارالسلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے۔

رندانہ

دل خستۂ غمیم و بود مے دوائے ما   با خستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست

شوخیِ رندانہ

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را   تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست

شوخی

نیکی ز تست، از تو نخواہیم مزدِ کار   ور خود بدیم کارِ تو ایم، انتقام چیست

یعنی اگر ہم نے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے، اس کی اُجرت ہم نہیں چاہتے۔

اور اگر ہم بد ہیں، تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں، پھر سزا کس لیے ہے؟

شوخی

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت   پُرسد چرا کہ نرخِ مے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پُرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا۔ پس اس نے ان کو اگر بیچ نہیں دیا، تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا، تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکے گی۔

عاشقانہ

لطفِ خدائے ذوقِ نشاطش نمی دہد   کافر دلے کہ با ستمِ دوست خو گرفت

یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو، اس کو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ بظاہر یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک نکتہ ہے، جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی، معاشیق کی بے التفاتی اور بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں، مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے، اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعثِ خوشنودیِ خدا ہے، اس کو اختیار نہیں کر سکتے۔

شوخی

رضول چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت
رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم   نہ ہے دِ من عجمی و طریقِ من عربی است

یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے۔ پس اگر اصولِ مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

ترکِ تغزل

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکتِ جم   قدح مباش ز یاقوت، بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی یعنی انگوری شراب چاہیے، جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو، یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسّر ہو تو نہ سہی۔

فخریہ

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست   عیارِ بیکسیِ من شرافتِ نسبی است

یعنی جس کو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے، اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں، اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

تصوف

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست   فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اس تمام غزل میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

تصوف

بجام و آینہ حرفِ جم و سکندر چیست   کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جامِ جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آیینہ سکندر کے عہد میں کیوں کہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

تصوف

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں ما را   قدم بہ بتکدہ و سر بہ آستانۂ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

تصوف

سپہر را تو بہ تاراجِ ما گماشتہ،   نہ ہر چہ دزدد زما بُرد، در خزانۂ تست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کر لے گیا ہے، وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

تصوف

مرا چہ جُرم گر اندیشہ آسماں پیماست   نہ تیز گامیِ توسَن ز تازیانۂ تست ؟

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالمِ بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔

شوخی

شباب و زہد، چہ ناقدردانیِ ہستی ست   بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد

تصوف

آخرِ منزلِ نخست خوی تو راہ می زند   اوّلِ منزلِ دگر بوے تو زاد می دہد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے، تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے، تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے، جو مثل زادِ راہ کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھواتی ہے۔

تصوف

اے کہ بدیدہ نم ز تست، وے کہ بسینہ غم ز تست   نازشِ غم کہ ہم ز تست، خاطرِ شادی می دہد
مستِ عطاے خود کند ساقیِ ما نہ مستِ مے   بادہ زیاد می برد، بسکہ زیاد می دہد

ں ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا، بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے۔

چوں کہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اس لیے ہم پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں؛ اس کے احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

اخلاق

دل اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غمِ ناں شد   زراعت گاہِ دہقاں می شود، چوں باغ ویراں شد

یہ مضمون مرزا کے حسبِ حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے۔ اوّل عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر۔ زراعت اور باغ کی مثال کس قدر مشل لڑکے

مطابقِ واقع ہوئی ہے۔

زنا گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را   قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے، وہ انسان ہی کے دم سے ہے۔ اگر حضرتِ انسان نہ ہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوقِ معنی شیرہ می ریخت در جانہا   نمے از لائے پالایش چکیدہ آبِ حیواں شد

لائے پالا، صافی کو کہتے ہیں، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقِ نمک می خیزد   مژدہ اے درد کہ ننگم ز دوا می آید

یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا کیوں کہ نمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی پانے کا باعث ہے، مجھے اس میں مزا آنے لگا ہے اور اے درد، تیری بن آئی ہے کیوں کہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

تصوف

ہمچو رازے کہ بمستی ز دل آید بیروں   در بہاراں ہمہ بوئے تو ز صبا می آید

اس شعر میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہِ فِی اَیَّامِ دَہرِکُم نَفَحَاتِ اَلَا فَتَعَرَّضُوا لَہَا۔

آزادی

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد   ولے خوشتر است آنکہ ایں ہم ندارد

عشق

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتر   ز چشمے کہ پیرایۂ نم ندارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے، اس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

شوخی۔

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالب!   بہشتے بود ہند کا دم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

تصوف

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند   دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

فخریہ

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند   ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند   بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بُردند   بہ سخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند   ہرچہ بُردند بہ پیدا، بہ نہانم دادند

رندانہ

ہرچہ در جزیہ ز گبراں مےِ ناب آوردند   بشبِ جمعۂ ماہِ رمضانم دادند

زار نالی

ہرچہ از دستگہِ پارس بہ یغما بُردند   تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اخیر کے چھ شعروں میں اس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا، اس کے عوض میں مجھ کو کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں، کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتشکدہ جل کر راکھ ہوگیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی؛ اور جب بت خانۂ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔ شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں اقبالِ کیانی مرحمت فرمایا۔ پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے تو توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیے، یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا، وہ مجھے چپکے سے دے دیا۔ اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لی، وہ ماہِ رمضان کی شبِ جمعہ کو مجھے پلائی۔ خلاصہ یہ کیا کہ جو کچھ پونجی لوٹی تھی، اُس میں سے زبان مجھ کو فریاد کرنے کے لیے دے دی۔

عاشقانہ متصوفانہ

خوباں نہ آں کنند کہ کس را زیاں رسد   دل بُرد، تا دگر چہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اس کے عوض میں کچھ اس سے وصول ہوگا کیوں کہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

تصوف

مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ، بداں آستاں رسد
گم شد نشانِ من چو رسیدم بکنجِ دیر   مانندِ آں صدا کہ بگوشِ گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ، یا وہ مقام، جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے، مراد لیتے ہیں۔ اپنا نشان دیر میں پہنچ کر گم ہو جانے سے مراد فنا ہے۔ اس کی تشبیہ اس صدا سے جو بہرے آدمی کے کان تک پہنچ کر گم ہو جاتی ہے، کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

اعزازِ نفس

دردام بہرِ دانہ نیفتم، مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزازِ نفس کا اظہار ہے۔ یعنی عزت کے ساتھ مجھے قید کرو، تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہ میں دانے کی لالچ سے جال میں آ پھنسوں گا، نہیں، بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہنچ جائے، میں قفس میں فوراً چلا آؤں گا۔

عاشقانہ

تیرِ نخست را غلط انداز گفتہ ام
اے وائے گر نہ تیرِ دگر بر نشاں رسد!

غلط انداز اس تیر کو کہتے ہیں، جو خطا کر کے غیرِ مقصود جگہ جا لگے۔ چوں کہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں، اس لیے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اس کا آ کر لگا ہے، مگر میں اس کو اپنی نحوستِ طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اسی جگہ آ کر لگا، تو میں سمجھوں گا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا، ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا، صحیح ہو جائے گا اور امید بالکل باقی نہ رہے گی۔

رندانہ

اُمیدِ غلبہ نیست، بہ کیشِ مغاں درآ
مے گر بہ جزیہ دست نداد ارمغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے، تو ان کا مذہب اختیار کر لے کیوں کہ اس صورت میں اگر شراب جزیے میں نہ آوے گی، تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آوے گی۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علتِ غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبہ کی امید نہ ہو تو لاچار کیشِ مغاں اختیار کرنا چاہیے، تا کہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ و ارمغان ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

عاشقانہ

جاں بر سرِ مکتوبِ تو از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریرِ جوابم بدر آورد

زارنالی

آں کشتیِ بشکستہ زموجم کہ تباہی
افگند در آتش گرازآبم بدرآورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے، تو اس کے تختوں کو پانی سے نکال کر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

تصوف

گر جلوۂ رُخِ تو بساغر ندیدہ ایم
چندیں بذوقِ بادہ دل از جا چہ میرود

زارنالی

ہفت آسیا بگردش و ما درمیانِ او
غالب دگر مپرس کہ برما چہ میرود

دنیا

محوِ آسودگی گر مرد رہی کاندریں وادی
چو خار از پا برآمد، پا ز داماں بر نمی آید

یعنی کسی حالت میں بھی آدمی دنیا کے مخصوں سے نجات نہیں پا سکتا۔ اگر کانٹا پاؤں سے نکل گیا تو پاؤں دامن میں الجھے گا۔

ترکِ بحثِ حلال

برآ از بزمِ بحث اے جذبۂ توفیق غالب را
کہ تُرکِ سادۂ ما با فقیہاں بر نمی آید

ترکِ سادۂ یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا تُرک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور فرہادِ من یعنی خود میں وہ "با فقیہاں بر نمی آید" یعنی مولویوں کی دلیلوں اور حجتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ "با کسے بر نیامدن" کے معنی ہیں اس سے سر بر اور عہدہ برآ نہ ہونا۔

تصوف

چشم و دل باختہ ام، دادِ ہنر خواہد داد
آنکہ چوں من ہمہ دانِ ہمہ بین تو شود

یعنی چوں کہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے، جیسا کہ تو ہے، اور میری آنکھ نے تجھ کو دیکھا ہے، جیسا کہ تو ہے، اس لیے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دے گا، جو میری طرح تیرا ہمہ داں و ہمہ بیں ہوگا

تصوف

کفر و دیں چیست جز آلایشِ پندارِ وجود   پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

عاشقانہ

رفتہ بودی دگر از جا بہ سخن سازیِ غیر   منّت از بخت کہ خاموشیِ ما یاد آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اس کی سخن سازی دیکھ کر ہماری خاموشی تجھ کو یاد آگئی جس سے تجھ کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق منہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

عاشقانہ

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روے تو بود   چشم سوے فلک و روی سخن سوے تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا گلہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھ سے کر رہا تھا۔ ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔

عاشقانہ

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند   کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود

تصوف

گر چنیں نازِ تو آمادۂ یغما ماند   بہ سکندر نہ رسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد بادشاہِ فاتح، اور دارا سے بادشاہِ مفتوح۔

تصوف

ہم بہ سودائے تو خورشید پرستم، آرے   دل ز مجنوں برد آہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں، تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے، جیسے مجنوں ہرنوں پر اس لیے فریفتہ تھا کہ ان کی آنکھیں لیلیٰ سے مشابہ تھیں۔

عاشقانہ

شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید   گر غمِ ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا، تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جا سکے گا یہاں تک کہ اس کو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکوں گا۔

مُصیبت

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز   مگر از دید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

تصوف

بستدہِ جرعۂ آبے بسکندر   دریوزہ گرِ میکدہ صہبا بہ کدو بُرد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور مے کدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کر لے گیا۔ مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو مے کدے یعنی خانقاہ کے ادنیٰ گداؤں کو نصیب ہے۔

تصوّف

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ   تا تلخیِ آں زہر توانم بہ گلو بُرد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں، تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر حلق سے دور کردوں۔

عاشقانہ

ز جوشِ شکوۂ بیدادِ دوست می ترسم   مباد مہرِ سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ اس کے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اس کو ضبط نہ کر سکوں، مگر اس کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی بیداد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ منہ پر جو مُہرِ سکوت لگی ہوئی ہے، کہیں اس کے ریلے میں بہ نہ جائے۔

جفاکشی

بریدہ ام رہِ دوری کہ گر بیفشانم   بجائے گرد، رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہِ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعر اور تکمیلِ فنِ سخن میں قائل نے کی ہے۔

عاشقانہ

مکن بہ پرسشم از شکوہ منع کایں خونیست   کہ خود ز زخمِ دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں، بلکہ نیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسشِ حال کرتا ہے تو اس وقت عاشقِ مہجور کا دل بھر آتا ہے اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسشِ حال کے وقت شکایت سے مجھ کو منع نہ کر کیوں کہ تو جو پرسشِ حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون

کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے، جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔

سفر

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد　　زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

یعنی عمر کا سفر میں گزرنا نہایت عمدہ ہے، البشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گزرے، اس پر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

عاشقانہ

بوصل لطف بہ اندازۂ تحمل کن　　کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گذرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اس کی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مر جاؤں، کیوں کہ پیاسے کے لیے وہ پانی موت ہے، جو سر سے گزر جائے۔

تصوف

ہر کجا دشنۂ شوقِ تو جراحت بارد　　جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
طوبیٰ فیضِ تو ہر جا گل و بار افشاند　　جز نسیمے بہ پرستش گہِ مریم نرسد

جگر گوشۂ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم۔ کو ان زخموں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے، ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی، اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں، ان میں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محرابِ مریم تک پہنچا ہے۔

شوخی

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب　　پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد
خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد　　وائے گر در روشِ نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے مقام پر اردو میں تیسرے شخص کے لیے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلب گار ہیں؛ بڑا مزا ہو، اگر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے، آدم کی نسل سے نہ ہوں۔

تصوف

جان در غمت فشاندن گر از قفا ندارد — تن در بلا فگندن ہم بلا ندارد

عاشقانہ

چوں لعلِ تست غنچہ، امّا سخن نداند — چوں چشمِ تست نرگس، امّا حیا ندارد

نایابیِ دوا

فارغ کسیکہ دل را با درد واگزارد — کشتِ جہاں سراسر دارد، گیا ندارد

شوخی

باید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند — آرے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

تصوّف

گو فنا تا ہمہ آلایشِ پندار بُرَد — از صُوَر جلوہ واز آئینہ زنگار بُرَد

ستمِ لطف نما

عشوۂ رحمتِ چرخ مخر کایں عیار — یوسف از چاہ برآرد کہ بہ بازار بُرَد

عشوہ خریدن: دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا۔ یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نہ آنا کہ یہ عیار یوسف کو چاہ سے اس لیے نکالتا ہے کہ بازار میں لے جاکر بیچ لے۔

تصوّف

ہر شمیمے را مشامے درخور است — بوئے پیراہن بکنعاں می رود

زارنالی

جوہرِ طبعم درخشانست، لیک — روزم اندر ابر پنہاں می رود
نومیدیِ ما گردشِ ایّام ندارد — روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بیقراریِ شوق

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل — شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں۔ اسی لیے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

سخنِ پُر درد

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جان نہ بود — بریدہ بود زبانے کہ خونچکان نہ بود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی، وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیو وہ زبان ہے، جو خونچکان یعنی دردِ دل سے بھری ہوئی نہ ہو۔

قسمت

حکیم ساقی و مے تُند و من زبد خوئی   ز رطلِ بادہ بخشم ایم ار گراں نہ بود

حکیم سے مراد خدا ہے۔ کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولتِ دنیا نہایت تُند ہے، مگر میں اپنی بد خوئی اور زیادہ طلبی سے شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں، تو غصے ہوتا ہوں۔

تصوّف

ز خویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم   کہ باز گردم و جُز دوست ارمغاں نہ بود

قاعدہ ہے کہ آدمی جب کہیں سفر کو جاتا ہے، تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ و ارمغان لے کر وطن میں واپس آتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جاچکا ہوں، اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں، تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لے کر نہ آؤں۔

تصرفِ شوق

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است   بسوئے قیس گرایش ز ساربان نہ بود

یعنی لیلی کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے، یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ اس وقت اس کی باگ تصرفِ شوقِ قیس کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

عاشقانہ

بتانِ شہرِ ستم پیشۂ شہر یار انند   کہ در ستم روشِ آموزِ روزگار انند
برند دل بادائے کہ کس گماں نہ برد   فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار انند

نہ زرع و کشت شناسند نے حدیقہ و باغ   نہ بہر بادہ ہوا خواہِ باد و بار انند

یعنی ہوا اور مینہ کچھ اسی لیے نہیں چاہتے کہ اس سے کھیتیاں اور باغ سر سبز و شاداب ہوں گے بلکہ صرف اس لیے کہ شراب پینے کا لُطف بغیر باد و باراں کے نہیں آئے گا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص ان کی طبیعت کا اقتضا تھا۔ جس مکان میں مرزا رہتے تھے اس کے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے کے آگے برآمدہ تھا جس کے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گزرگاہ سے تقریباً چار گز

اونچا ہوگا۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابر و باراں کی مدارات میں مصروف تھے۔ اس وقت عالمِ سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے۔ ایسا برسے کہ گلی کی رَو کا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا: حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائے گا۔ مرزا ہنس کر چپ ہو رہے۔

لذتِ سعی

چہ لطفِ رہروی آنرا کہ خار خاری نیست   مرو بکعبہ، اگر راہ ایمنی دارد

خار خار، خلجان۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہ ہو، سفر میں کچھ لطف نہیں۔ پس اگر کعبے کی راہ پُرامن ہے، تو کعبہ جانا نہیں چاہیے۔ فی الحقیقت جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کر کے مقامِ مقصود تک پہنچتے تھے، جو خوشی ان کو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی، اُس کا سواں حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی، جو ریل اور اسٹیمر میں آج کل سفر کرتے ہیں۔

ناشناسائی ابنائے زماں

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے   غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے اور اس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اس کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اس لیے کہ کسی کو اپنا قدر دان اور پایہ شناس نہیں پاتا اور کچھ اس لیے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا اپنے تئیں غریبِ شہر یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں، جو کہنے ہی کے لائق ہیں، کہنی چاہتا ہے۔

عاشقانہ

پشیم ازاں بپرس کہ پرسی ز اہلِ کوے   گویند خستہ زحمتِ خود زیں دیار برد
نازم فریبِ صلح کہ غالب زکوے تو   ناکام رفت و خاطرِ امیدوار برد

رندانہ

ہر کرا رختِ شبانہ نبود از نمِ مے   جائے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد

جامہ یا رخت کا نمازی نہ ہونا اُس کے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

رندانہ

مغنیاں! بادہ عزیزست مریزید بخاک
جوشد از پردہ دگر، خونِ سیاوش مباد

دوسرے مصرع کی تقدیرِ عبارت یوں ہے: مباد خونِ سیاوش، دیگر از پردہ بجوشد سیاوش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بے گناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اس کے خون کے وبال میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مغنیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے، اس کو زمین پر مت گراؤ، ایسا نہ ہو کہ خونِ سیاوش پھر جوش مارے۔

شکایتِ چرخ

از رشک کرد آنچہ بہ من روزگار کرد
در خستگی نشاطِ مرا دید، خوار کرد

یہ غزل غالباً اس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی زمانے نے جب مجھ کو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے، تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اب تو خوش نہ رہے گا۔

شکوۂ چرخ

در دل ہمی ز بینشِ من کینہ داشت چرخ
چوں دیدگان نماند نہاں، آشکار کرد

یعنی میری دانش و بینش کے سبب مجھ سے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے، تو آسمان کھل کھیلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

تقدیر

لنگر گسستہ صرصر و کشتی شکستہ موج
دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں، بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔

شوخی

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر
نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

ماحصل شعر کا یہ ہے کہ در حقیقت میں ہوں تو نا اُمید، مگر چوں کہ تجھ سے ہے، اور تو کفر سے راضی نہیں، اس لیے مجبوراً اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔

تصوف

بشرع آویز و حق میجو ز مجنوں کم نہ بارے   دلش با محمل است، اما زبان با ساربان دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھو اور خدا کو بھی ڈھونڈھو: آخر تو مجنوں سے کم نہیں ہے کہ اس کا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے۔ مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے۔ یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلیٰ سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر تو نوادر افکار سے ہے۔

عاشقانہ

خدارا! وقتِ پرسش نیست، گفتم بگذر از غالب   کہ ہم جاں بر لب و ہم داستانہا بر زباں دارد

"گفتم" یعنی میں نے کہہ دیا ہے یا میں کہے دیتا ہوں کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے تو غالب کے حال سے درگزر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے کیوں کہ اس کی جان لبوں پر ہے اور داستان زبان پر، مبادا وہ اپنی درد انگیز داستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اس کی جان بھی نکل جائے۔

گویند صنعاں توبہ کرد از کفر، ناداں بندۂ   کز خود فروشیہائے دیں بخشش ز یزداں خوش نکرد

صنعان کا قصہ مشہور ہے، جو پہلے عابد تھا۔ پھر فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا، یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی۔ پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعان کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے: وہ عجب نادان بندہ ہے جس نے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا۔ یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نہ کرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اس کو بخش دیتا۔ اور اب جو وہ بخشا جائے گا، تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی۔ پس گویا اس نے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ "خوش کردن" کے معنی ہیں پسند کرنا۔

عاشقانہ

آں خود بہ بازی می برد دیں یاد و چوں می شمرد   بنمودمش دیں، خندہ زد، آوردمش جاں، خوش نکرد

شوخی

با من میاویز اے پدر! فرزندِ آزر را نگر   ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

"میاویز" یعنی مجھ سے جھگڑا مت کر۔ "فرزندِ آزر" ابراہیم علیہ السلام۔ باقی شعر کے معنی

ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے، بلکہ مرزا کے حسبِ حال بھی ہے، کیوں کہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے، مرزا کے والد سنی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

شوخی

در ستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست
آں کہ چندیں تکیہ بر حلمِ خداوندش بود

کہتا ہے کہ اس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جس کو خدا کے حلم پر اس قدر بھروسا ہے کہ اس کے بھروسے پر ظلم کیے چلا جاتا ہے اور اس کے مواخذے سے نہیں ڈرتا۔

اخلاق

با خرد گفتم: نشانِ اہلِ معنی باز گوے
گفت: گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہرِ خواری بسکہ سرگرمِ تلاشم کردہ اند
پارۂ نزدیک در ہر دُور باشم کردہ اند

"دُور باش" ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں، جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھ کو جو قضا نے سرگرمِ تلاش کیا ہے، اس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس راہِ تلاش میں جو دھتکار مجھ پر پڑتی ہے، اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح جو امر میرے سرگرمِ تلاش کرنے سے مقصود ہے، وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر "دور باش" پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

زار نالی

چرخ ہر روزم غمِ فردا بخوردن می دہد
تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

منقبت

از چہ غالب خواجگیہاے جہان ننگِ منست
گر نہ با سلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

عاشقانہ

بخشمم ناسزا می گوید و از لطفِ گفتارش
گماں دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید

"لطفِ گفتار" کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرایے میں نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے کہ معشوق غصے میں برابر مجھ کو بُرا بھلا کہتا ہے، مگر اس کے لطفِ کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ اس کی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو بروں آرد جمش جامِ خود انگارد　　دگر لختے برافشانم، سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اس کو پہلو سے نکال کر دکھاؤں، تو جمشید اس کو اپنا جامِ جہاں بیں سمجھے؛ اور اگر اس کا ایک لختہ نکال کر ڈال دوں، تو سلیمان اس کو خاتمِ سلیمانی کا نگیں بتائے۔

عاشقانہ

من بہ وفا مُردم و رقیب بَدر زد　　نیم لبش انگبین و نیمہ تبرزد

”بَدر زد“ یعنی نکل بھاگا۔ ”تبرزد“ مصری۔ کہتا ہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مر گیا، اور رقیب نکل بھاگا۔ گویا معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اس میں پھنس کر رہ گیا اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اُس پر سے اُڑ گیا۔

عاشقانہ

دعویٰ او را بود دلیل بدیہی　　خندۂ دنداں نما بجنس گہر زد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اس کے دانت نظر آنے لگے۔ پس اس کا خندہ گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں اور اس دعویٰ کی دلیل اس کا خندۂ دنداں نما ہے کیوں کہ اس کے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اس کے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پس اس کے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے

شکوۂ چرخ

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند　　نشیمنش بہ سرِ رہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو اُلٹ کر اوپر کا رُخ نیچے اور نیچے کا رُخ اوپر کر دیتا ہے۔

امتحانِ الٰہی

تو نالی از خلش خار و تنگی کہ سپہر　　سرِ حسین علی بر سناں بگرداند
برو، بہ شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا　　چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند　　کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

تصوف

تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد شوخی ز حد گذشت، زبانم بریدہ باد

اوّل یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اتر جائے۔ پھر یہ سمجھ کر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا، کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی، میری زبان قلم ہوجیو۔

عاشقانہ

گر رفتہ ام ز کوے تو، آساں نہ رفتہ ام ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد
ذوقیست ہمدمی بفغاں، بگذرم ز رشک خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں، مگر چونکہ کئی آدمیوں کے مل کر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے، اس لیے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں: خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

عاشقانہ

در تیغ زدن منتِ بسیار نہادند بردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا؛ پہلے سر کا بوجھ تھا، اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اتارا ہے۔

و [illegible] مے و نے

روزے کہ بہ مے زور و بہ نے شور نہفتند اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نکردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد، دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور ودیعت کیا تھا، اس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تصوف

تاجرِ شوق دراں رہ بتجارت نہ رود کہ در انجا مدد و سرمایہ بغارت نہ رود

یعنی شوقِ الٰہی کا تاجر اس رستے سے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اس رستے میں سرمایہ لوٹا نہ جائے۔

تصوف

رمزِ شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ محرمِ راز وہی شخص ہے، جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اس کے موافق عمل کرتا ہے: کھانے میں، پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، غرض کہ ہر کام اور ہر چیز میں نیچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

شوخی

زاہد از حورِ بہشتی بجز ایں نشناسد   کہ شود دست زدِ شوق و بکارت نرود

دست زدِ شوق ہونا یعنی شوق کے زیرِ مشق ہونا۔ خلاصۂ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ سے ان کے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ و کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔

عاشقانہ

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر   چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اس کو دیکھ، اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ" میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"۔

تصوف

ز من بجرمِ تپیدن کنارہ می کردی   بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

تصوف

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد   در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا دام بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کے لیے ڈالا تھا، وہ اُگا اور بڑھا اور یہاں تک بڑھا کہ اس میں گھونسلے بن گئے، مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

غزل مسلسل عاشقانہ و رندانہ

اے ذوقِ نوا سنجی! بازم بخروش آور   غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور
گر خود بجہد از سر، از دیدہ فرو بارم   دل خون کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور
ہاں ہمدمِ فرزانہ! دانی رہِ ویرانہ   شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش، آور

ویرانہ یعنی غریب خانہ۔ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے کی یعنی شراب۔

شورابۂ ایں وادی تلخ ست اگر رادی
از شہر بسوے من سرچشمۂ نوش آور

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے۔ اے ہمدم فرزانہ! اگر تو فیاض ہے تو میرے لیے میرے لیے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا۔

دانم کہ زرے داری ہر جا گزرے داری
مے گر ندہد سلطان، از بادہ فروش آور
گر مغ بکدو ریزد، بر کف نہ و راہی شو
ورشہ بسبو بخشد، بردار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے، اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا، ورنہ بادہ فروش سے لا۔ اگر مغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تونبے میں ڈال دے، تو تونبا ہاتھ پر رکھ اور چل دے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل
آں در رہ چشم افگن، ایں را پے گوش آور

رامش، راگ۔ آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل

گاہے بسبکدستی، از بادہ ز خویشم بر
گاہے بسیہ مستی، از نغمہ بہوش آور

گاہے بسبکدستی، یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مدہوش کر دے اور پھر جب میں مست ہو جاؤں تو مجھ کو گانا سنا کر ہوشیار کر۔

غالب کہ بقالش باد ہمپاے تو گر ناید
بارے غزلے فردے زاں موینہ پوش آور

ہمپاے تو یعنی ہمراہِ تو۔ موینہ پوش، اونی کپڑے پہننے والا۔ مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے

عاشقانہ

یقین عشق کن واز سر گماں برخیز
بہ آشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

تصوف

چرا بہ سنگ و گیا بیچی اے زبانۂ طور
ز راہِ دیدہ بدل در رو و ز جاں برخیز

زبانہ، شعلہ۔ وہ تجلی جو سنگ و گیاہ یعنی کوہِ طور اور نخلِ ایمن پر ظاہر ہوئی تھی۔ اس کی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلۂ طور! پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں، کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اتر اور جان سے بھڑک اٹھ۔

عاشقانہ

عیادت است، زپرخاش تند خوئی چیست؟ بیا و غمزدہ بنشین ولب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھ کر بے لطف ہوا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیے آیا ہے، لڑائی کے لیے نہیں آیا۔ پھر یہ تند خوئی اور بدمزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ بس آ اور مغموم بیٹھ اور ہونٹ کاٹتا ہوا اٹھ۔

اخلاق

نفس چوں زبوں گردد، دیو را بفرماں گیر محرمِ سلیمانم، نقشِ خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا، پھر جن کو محکوم کر لینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرمِ راز ہوں، اس کی انگوٹھی پر یہی نقش کندہ تھا جس سے تمام جن اس کے محکوم تھے۔

رندانہ

بوسہ از لبانم دہ، عمرِ خضر از من خواہ جامِ مے بہ پیشم نہ، عشرتِ جم از من پرس

منقبت

وردِ من بود غالب! یا علیِ بوطالب! نیست بخل با طالب، اسمِ اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ "یا علی ابن ابی طالب" ہے، مجھ کو طالبِ صدق سے کچھ بخل نہیں ہے، اسمِ اعظم مجھ سے پوچھ لے کہ یہی "یا علی" اسمِ اعظم ہے۔

عاشقانہ

لطفے بتحتِ ہر نگہِ خشمگیں شناس
آرایشِ جبینِ شگرفان زچیں شناس

اخلاق

بے غم نہادِ مرد گرامی نمے شود زنہار، قدرِ خاطرِ اندوہگیں شناس!

زنہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

تصوف

دود سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش دیدہ بر خواب پریشاں زد، جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھ کر

شامیانہ سا بن گیا، ہم نے اس کا نام آسمان رکھ لیا اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا، اس کو جہاں سمجھ گئے۔ اسی طرح اس کے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے مثلاً

تصوف

وہم، خاکے ریخت در چشم، بیاباں دیدمش ۔۔۔ قطرۂ بگداخت، بحرِ بیکراں نامیدمش
باد دامن زد بر آتش، نوبہاراں خواندمش ۔۔۔ داغ گشت آں شعلہ از مستی، خزاں نامیدمش

چوں کہ نوبہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے اس لیے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سلگایا، میں نے اس کو بہار قرار دے دیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بجھا، تو میں نے اس کا خزاں نام رکھ دیا۔

تعریض بہ اہلِ وطن

غربتم ناسازگار آمد، وطن فہمیدمش ۔۔۔ کرد تنگی حلقۂ دام، آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اس کو وطن سمجھا، گویا جب دام کے حلقے نے تنگی کی، تو میں اس کو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری اور مغائرت دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھ کو راس نہ آیا، تو میں نے اس کو بھی وطن ہی تصور کر لیا۔

عاشقانہ

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش ۔۔۔ رفت از شوخی بآیینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا، جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے؛ اور وہ شوخی سے اٹھ کر اس طرح چلا گیا کہ میں اس کو جان کہہ اٹھا۔ یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے، وہی اس کے جانے سے ہوئی۔

عاشقانہ

دل زبان راز دانِ آشنائیہا نخواست ۔۔۔ گاہ بہماں گفتمش گاہے فلاں نامیدمش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم ۔۔۔ کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش
دل در غمش بسوز، کہ جاں می دہد عوض ۔۔۔ ور جاں دہی غمے، بہ ازاں می دہد عوض

نبود سخن سرائیِ ما رائگاں کہ دوست   دل می برد ز ما و زباں می دہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہم کو مفت نہیں ملی ہے، بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اس کے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقت جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا، تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی، خواہ عشقِ مجازی ہو، خواہ عشقِ حقیقی۔

رندانہ

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ   ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ دروست   ازاں رحیقِ مقدس درین خمار چہ حظ

تصوف

چمن پُر از گل و نسرین و دلربائے نیست   بدشتِ فتنہ ازیں گردِ بے سوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذاتِ بے نشان ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں، اس گردِ بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو خطرہ ہوتا ہے اور اس کی کمک کے لیے کوئی سوار آتا ہے، تو اول گرد نظر آتی ہے، پھر سوار نمودار ہوتا ہے، مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں، مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

تصوف

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا   ز میوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار چہ حظ

یعنی جب کہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پتھر ناپید ہیں، تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے یعنی جب تک جاذبۂ عنایت ہم کو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہدِ حقیقی خود اپنی جھلک نہ دکھائے، ہم کو کیا فائدہ؟

شکایت

نہ مرا دولتِ دنیا، نہ مرا اجرِ جمیل   نہ چو نمرود توانا، نہ شکیبا چو خلیل

فکرِ عقبیٰ

بُنہ و بار بہ شبگیر در افگندہ براہ
آنکہ دانست سراسیمگیِ صبحِ رحیل

بُنہ و بار، ساز و سامان۔ شبگیر، پچھلی رات۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے، وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔

رندانہ

زکنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل

یہ خطاب ہے خدا کی طرف۔ معنی ظاہر ہیں۔

ناقدردانی

غالبِ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری
بدیارے کہ نداند نظیری ز قتیل

نداند نظیری ز قتیل۔ یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے

فخریہ

شعلہ چکد، غم کرا؟ گُل شگفد مُزد کو؟
شمعِ شبستانیم، بادِ سحرگاہیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بے دردی اور ناقدردانی ظاہر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں گویا "شمعِ شبستانی" ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ہیں، مگر کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں؛ اور گویا میں بادِ سحرگاہی ہوں، جو پھول کھلاتی ہے، مگر اس کی اُجرت کوئی ادا نہیں کرتا۔

شوخی

از صفِ طفلاں و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ
زود ز کو نگذرد کوکبۂ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے نہیں گزرتی کیوں کہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے پتھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

تصوف

جذبِ تو باید قوی، کاں ببرد باک نیست
گر نتواند رسید بخت بہ ہمراہیم

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیے، جو مجھ کو منزل تک لے جائے۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے، تو کچھ حرج نہیں۔

فخریہ

غالبِ نام آورم، نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

رندانہ

بر لبِ یا علی، سرائے، بادہ روانہ کردہ ایم   مشربِ حق گزیدہ ایم، عیشِ مغانہ کردہ ایم

روانہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چوں کہ لب پر یا علی، جاری ہے، اس لحاظ سے تو ہم نے مذہبِ حق اختیار کیا ہے؛ اور چوں کہ اس پر شراب جاری ہے اس لحاظ سے مُغوں یعنی آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں۔ یعنی دین و دنیا دونوں ہم کو حاصل ہیں۔

ندامت

بادہ بوام خوردہ و زر بہ قمار باختہ   وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نکردہ ایم

یعنی شراب پینا اور روپیہ ضایع کرنا تو بُرا تھا ہی، ہم نے ان برائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا۔ شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھویا تو جوئے میں۔

کتمانِ عشق

نالہ بلب شکستہ ایم، داغ بدل نہفتہ ایم   دولتیانِ ممسکیم، زر بخزانہ کردہ ایم

نالہ بلب شکستہ ایم یعنی اس کو منہ سے نہیں نکلنے دیتے اور ضبط کرتے ہیں، اور داغ کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں؛ ہم دولت مند تو ہیں مگر خسیس ہیں، اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔

تصوف

گر فراموشی بفریادم رسد وقت است وقت   رفتہ ام از خویشتن، چندانکہ در یادِ خودم

کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گزر گیا ہوں، مگر ابھی آپ کو بھولا نہیں ہوں، اگر فراموشی اس وقت میری فریاد کو پہنچے اور آپ کو بھلا بھی دے، تو بہت مناسب ہے۔

تصوف

ہر قدم لختے ز خود رفتن بود در بارِ من   ہمچو شمعِ بزم در راہِ فنا زادِ خودم

کہتا ہے کہ راہِ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار، یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے، وہ صرف یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہِ فنا میں آپ ہی اپنا زادِ راہ ہے کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زادِ راہ کی طرح نبڑتی جاتی ہے، اسی طرح میں بھی آپ اپنا زادِ راہ ہوں۔

عاشقانہ

یاد باد آں روزگاراں کا عتبارے داشتم   آو آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے، جب کہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتش ناک تھی اور آنکھ اشک بار۔

بیخودی

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف   ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

عاشقانہ

ایں چہ شوراست کاز شوقِ تو در سر دارم   دلِ پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

تصوف

آں چرا در طرب و ایں ز چہ رو در تعب است   خندہ بر غفلتِ درویش و تونگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش و تونگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جب کہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں ہیچ ہیں، تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کیوں ہے؟

مناجات

رازدارِ تو و بدنام کنِ گردشِ چرخ   ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھ سے تکلیف پہنچتی ہے اس کی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں، مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس در حقیقت تیرا احسان مند ہوں، مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار۔

عاشقانہ

خوشنودم از تو و زپے دورباشِ خلق   آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو جفا کار اس لیے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ در حقیقت میں تجھ سے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

فقر

دوزند گر بعرض زمیں را بہ آسماں   حاشا کزیں فشار در ابرو خم افگنم

افسوس متضمن فخر

ہم بعالم ز اہلِ عالم برکنار افتادہ ام   چوں امامِ سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

زمن حذر نکنی اگر لباسِ دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں، جن کو متشرع اور مقدس سمجھ کر اُن کے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر ان کو ذرا ٹٹول کر دیکھیے، تو وہ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے جو نوعمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

شکایت

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ ہنوز
ہزار دزد بہر گوشہ در کمیں دارم

"ہنوز" کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اردو میں "تاہم" یا "باوجود اس کے" بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں، جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو، مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چراتے ہیں، میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

توقع

ز وعدہ دوزخیاں را فسردن نیازارند
توقعے عجب از آہِ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہلِ دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعادِ معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھیں گے پس اس خیال سے میں اپنی آہِ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں، یعنی یہ کہ آہِ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی۔ اس توقع کو عجیب اس لیے کہا ہے کہ اس کو بھی دوزخ پر قیاس کر کے اس نے آخرکار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالبؔ
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے جس کا اصل مصرع یہ ہے:

مرا بہ سادہ دلیہاے من تواں بخشید

نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا کیا ہے گویا اس کو چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا مگر میں نے اس پر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اس خطا پر آفریں کا امیدوار ہوں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تا کہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں مل کر پلٹ دیں اور حکمِ قضا کو رطلِ گراں یعنی جامِ شراب کی گردش سے پھیر دیں۔

بگوشہ بنشینیم و در فراز کنیم
بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

در فراز کنیم یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اد کسی کو نہ آنے دے۔

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم
مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکار و بار زنے کارداں بگردانیم
گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم
گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ: تملق و خوشامد۔ سخن کو ادا کے ساتھ ملانا، راؤ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم
بشوخیے کہ رخِ اختراں بگردانیم
ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم
بلائے گرمیِ روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں اور اس کو طلوع نہ ہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہان سے ٹال دیں۔

بوہمِ شب ہمہ را در غلط بیندازیم
ز نیمہ رہ رمہ را شباں بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈال دیں یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف الٹا پھیر دیں

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں ان کو لڑ کر باغ کے باہر ہی خالی جھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بصلح بال فشانانِ صبحگاہی را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آ کر کلیل کرتے ہیں، ان کو نرمی اور

چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

زحیدریم من و تو، زما عجب نہ بود　　گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں، ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقولِ بعض حیدر کرار سے معجزۂ ردّ الشمس ہوا تھا، ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

ندامت

رفت بر ما آنچہ خود ما خواستیم　　وا یہ از سلطان بہ غوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے، تو اس کو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ ہم پر جو سختی گزری، وہ خود ہم نے ہی چاہی تھی، کیوں کہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل بہت کیا، اس لیے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔

فخریہ

دانش و گنجینۂ پنداری یکے ست　　حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں، کیوں کہ جو چیز ہم نے علانیہ مانگی یعنی دولت، وہ خدا نے ہم کو پوشیدہ طور پر دی یعنی علم و ہنر۔

تصوف

رفت و باز آمد ہما در دامِ ما　　باز سر دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا، پھر آن پھنسا، اب چاہیے تھا کہ اس کی زیادہ نگرانی کرتے اور اس کو نکلنے نہ دیتے، مگر ہم نے اس کو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولتِ دنیا، اور عنقا سے مراد احدیتِ ذات

آزادی

وحشتے در سفر از برگِ سفر داشتہ ایم　　توشۂ راہ، ولے بود کہ برداشتہ ایم

فخر متضمن شکوہ

داغِ احسانِ قبولِ لئیمانش نیست　　ناز بر خرمیِ بختِ ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمیِ بختِ ہنر یعنی سرسبزیِ بختِ ہنر کہتا ہے کہ ہم کو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیوں کہ اس پر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا

داغ نہیں ہے۔

فخر متضمن شکایت

زخم جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم   موجِ گہرم جنبش و رفتار ندانم

یعنی جس طرح زخم جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آب گہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے، ایسا ہی میرا حال ہے۔ یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے، نہ میرے کمال کی اطلاع ہے۔

فخر

نقدِ خردم سکۂ سلطاں نہ پذیرم   جنسِ ہنرم گرمیِ بازار ندانم

شکر

غالب نبود کوتہی از دوست ہمانا   زانساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھ کو شعور نہیں ہوتا کہ کیوں کر یہ کام بن گیا۔

ذیل کی غزل نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا، اس میں پڑھی گئی تھی۔ چوں کہ دلی کے تمام نامور شعرا کا، جو وہاں فارسی غزلیں لکھ کر لے جاتے تھے، مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے، اس لیے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کی جاتی ہے۔

عاشقانہ

ہا پری چہرہ غزالان وز مردم رمِ شان   دلِ مردم بخمِ طرۂ خم در خمِ شان
کافرانند جہاں جوے کہ ہرگز نبود   طرۂ حور دلاویز تر از پرچمِ شان
آشکارا کشش بدنام و نکونامی جوے   آہ ازیں طائفہ وانکس کہ بود محرمِ شان

صدق طلب

رشک بر تشنۂ تنہا روِ وادی دارم   نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزمِ شان

اخلاق

بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی، ہشدار   خستگانند کہ دانی و نداری غمِ شان

یعنی ان مصیبت زدوں کو جانے دے، جن کو تو نہیں جانتا، مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جن کو تو جانتا ہے مگر ان کا کچھ غم تجھ کو نہیں۔

بیدردی اطبا

داغِ خوں گرمیِ ایں چارہ گرانم، گوئی
آتش است آتش، اگر پنبہ و گر مرہم شاں

ذکرِ معاصرینِ خود

ایکہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم
چہ بما منتِ بسیار نہی از کرمِ شاں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

غالبِ سوختہ جاں، گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

مومن یعنی حکیم مومن خان جن کے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں نیّر یعنی نواب ضیاء الدین احمد خان رئیسِ لوہارو جن کا کلام دونوں زبانوں میں بقدرِ معتد بہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ صہبائی یعنی مولانا امام بخش جن کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ علوی مولانا عبداللہ خان علوی استادِ مولانا صہبائی جن کی نظم و نثر چھپ چکی ہے، اور عربی میں بھی ان کے قصائد موجود ہیں حسرتی، نواب محمد مصطفیٰ خان رئیس جہانگیر آباد جن کے دیوان اُردو فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں اور اس کے سوا سفرنامۂ حج، تذکرۂ گلشنِ بیخار، اور رقعاتِ فارسی بھی اُن کی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ آزردہ، مولانا مفتی محمد صدر الدین خان جن کا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا، مگر افسوس ہے کہ اس میں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے لیکن بعض مذہبی رسالے جو اُن سے یادگار رہ گئے ہیں، شائع ہو چکے ہیں۔

فخریہ

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا
چاکہا از تارِ جیبِ پیرہن خواہد شدن

حرفِ حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاقِ فتنہ میں جگہ پائے گا یعنی فتنہ کو پسند آئے گا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اس کو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کرے گا، اور دونوں اپنی اپنی جگہ اس پر فخر کریں گے اور ایک دوسرے

کو جھٹلائیں گے اور آپس میں گل خپ ہوں گے۔

انجامِ شاعری

بس، چہ میگویم؟ اگر اینست وضعِ روزگار دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن

اس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور یوں ہوگا؛ پھر کہتا ہے کہ بس ہے، میں کیا کہتا ہوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعر، بابِ سوختن یعنی جلا دینے کے لائق ہو جائے گا۔

انجامِ شاعری

چشمِ کورِ آئینہ دعویٔ نگہت خواہد گرفت دستِ شل مشّاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن
شاہدِ مضموں کہ اینک شہریِ جان و دلست روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

یعنی آئندہ یہ حال ہوگا کہ شاہدِ مضمون جواب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے، وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائے گا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گہری نگاہ سے غور کی جاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہ جائیں گے اور ان کی تہ کو کوئی نہ پہنچے گا۔

انجامِ شاعری

زاغِ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں ہم نوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن

جنگلی کوّے (یعنی تک بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں کی) برابری کریں گے۔

انجامِ دنیا

شاد باش اے دل! ادریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شدن

اب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے؛ یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں، ایک دن موت کے نوحے بن جائیں گے۔

انجامِ دنیا

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید ہم بساطِ بزمِ مستی پُرشکن خواہد شدن
گردِ پندارِ وجود از رہگذر خواہد نشست بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے، یہ سب بیٹھ جائے گا۔ یعنی سب فنا ہو جائیں گے اور توحیدِ عیانی کا دریا موجزن ہوگا۔ یعنی ذات

واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

ترجیح کافر بہ مسلماناں

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو   کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی؛ وہ اس کے پاس جاتی ہے جو اس کے لائق ہوتا ہے۔ پس تو اے مخاطب! اپنی سعی سے پشیمان ہو اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر نہیں ہو سکتا، لاچار مسلمانی پر قناعت کر۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے، جو صوفیۂ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتب فقر و درویشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے، اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسبِ حال بھی ہو سکتے ہیں، جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نہ گزرے ہوں، مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتائج افکار میں شمار کیے جائیں کیوں کہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جس کو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے، یہ تو بہت آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی کہ اس کی بھلائی ان کے بغیر دشوار معلوم ہو اور ان تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا، یہاں تک کہ بد مذہب اور کافر مشہور ہونا، مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہ ہونا نہایت دشوار، بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ایسا فرد دنیا کے عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے، مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں حسنِ اتفاق سے اس وقت ایک شخص موجود ہے، جس کی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خان جس نے کافر، ملحد، نیچری، دجال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہ ہوا۔

خطاب بہ ناقصاں

از مہرہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن   جوئی، بہ خیاباں رَو، سیلی، بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی برائے نام جاری ہونے سے قلزم نہیں ہو جاتا۔ اے مخاطب! تو ایک نالی ہے، باغ کی کیاریوں میں جا؛ اور ایک رَو ہے، جنگل کی راہ لے۔ یہ ان ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے، جو کسی فن میں شُد بُد حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

اطاعت

گر چرخِ فلک گردی، سر بر خطِ فرماں نہ　　ور گوے زمیں باشی، وقفِ خمِ چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے، اطاعت و فرمانبرداری کرنی ضرور ہے، چاہو اطاعت کو عام لو اور چاہو، خاص خدا کی فرماں برداری مراد رکھو کیوں کہ جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرماں برداری کے کام نہیں چلتا، اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

صبر و شکیب

در بندِ شکیبائی مردم ز جگر خائی　　اے حوصلہ تنگی کن اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں کلیجہ مسوستا مسوستا مر گیا یعنی تھک گیا، اب سوا اس کے اور کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلے! تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے، اب بر خلاف اس کے تنگ ہو جا؛ اور اے غم تو زیادہ ہو جا، تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے اور کھل کھیلوں اور جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

شکایت

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر　　بر خرمنِ ما برق شو بر مزرعہ باراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اوّل سرمایہ دیتے ہیں، پھر جب چاہتے ہیں اس کو تباہ کر دیتے ہیں، مگر شاعر بطور مبالغے کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینہ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے۔ یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے، اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور عاشقانہ ہے، جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی

ہیں اور اس کو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایتِ ظریفانہ پر ختم کیا ہے۔ اس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے۔ خیالات بلند نہیں ہیں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بتے دارم از اہلِ دل رَم گرفتہ   بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

دل گرفتن اکتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑتا ہے۔

ز سفاک گفتن چو گل بر شگفتہ   دریں شیوہ خود را مسلّم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اسے سفاک کہتا ہے، تو برا نہیں مانتا، بلکہ خوش ہوتا ہے۔ گویا اپنی سفاکی کو مسلّم الثبوت مانے ہوئے ہے۔

فسوں خواندہ و کارِ عیسیٰ نمودہ   پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔

دَمش رخنہ در زُہدِ یوسف فگندہ   غمش گندم از دستِ آدم گرفتہ

"دَم" سے مراد بات ہے۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اس کے غم میں آدم کو گندم جیسی چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے طعنہ بر لحنِ مطرب سرودہ   گہے خردہ بر نطق ہمدم گرفتہ
بہ بیداد صد کُشتہ برہم نہادہ   بہ بازیچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی کو مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

برویش زگرمی نگہ تاب خوردہ   بکویش برفتن صبا دم گرفتہ
نبارد زمن ہیچ گہ یاد ہرگز   مگر خوے خاقانِ اعظم گرفتہ
ظفر کز دمِ اُوست در نکتہ سنجی   کہ غالب بآوازہ عالم گرفتہ

یہاں دَم کے معنی افسون اور کرامت کے ہیں۔ تقدیرِ عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آوازہ عالم گرفتہ۔

غزل مسلسل در توحید

چوں زبانہا لال و جانہا پُر ز غوغا کردۂ   بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جب کہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اس کے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے، اب تو اپنے ہی سے پوچھ

ے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش   جاں فدایت، دیدہ از بہرِ چہ بینا کردۂ
ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است   انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جس کی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں۔ پس اگر تو نے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اس کو بخش دیا، تو یہ عین انتقام ہے، وہ اس شرمندگی سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہم کو کچھ سزا نہیں دی، گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

صد کشاد آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودۂ   مژدہ باد آنرا کہ محوِ ذوقِ فردا کردۂ
خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردۂ   با درستاں گر نوازشہائے پیدا کردۂ

"خستگاں" زخمی اور شکستہ دل لوگ۔ یعنی جن کی حالتِ زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا ان پر خدا کا غصہ ہے۔ "درست" صحیح و سالم کو کہتے ہیں۔ "درستان" اس کی جمع ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے، گویا ان پر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں، تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

چشمۂ نوش ست از زہرِ عتابت کامِ جاں   تلخیِ مے در مذاقِ ما گوارا کردۂ

خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے، اور اس کو شراب سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے مگر شرابیوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں، اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو، مگر تیرے عشاق اس کو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است   خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کر کے اس میں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے، تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں۔ یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود   پیش ازاں کیں در رسد آنرا مہیا کردۂ

کہتا ہے کہ بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی، اور بیماری کا علاج سنگ و گیاہ یعنی

معدنیات اور نباتات میں تھا، پس تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیاہ کو مہیا کر دیا، جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ میگرید، زباں می نالد و دل می تپد   عقدہ ہا از کارِ غالب سر بسر وا کردہٗ

مقطع میں پھر اپنی عادت کے مطابق شوخی کی ہے۔ تمام نا ملائم حالتوں کو جو قائل پر گزر رہی ہیں، ان کو ازراہِ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرایے میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زبان فریاد کرتی ہے، اور دل تڑپتا ہے۔ گویا تمام عقدے تو نے حل کر دیے ہیں۔ چوں کہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد کرنا اور دل کا تڑپنا ان تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے، اس لیے ان تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر محمول نہ کیا جائے، تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روئے، زبان فریاد کرے، اور دل تڑپے۔ پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے، وہ تو نے سب حل کر دیے۔

غزل مسلسل عاشقانہ

تابم ز دل برد کافر ادائے   بالا بلندے، کوتہ قبائے
چوں مرگِ ناگہ بسیار تلخے   چوں جانِ شیریں، اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے   در دل ستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے، پوزش پسندے   طاقت گدازے، صبر آزمائے
از خوئے ناخوش، دوزخ نہیبے   وز روئے دلکش، مینو لقائے
زردشت کیشے، آتش پرستے   برسم گزارے، زمزم سرائے

بَرسَم جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں اور عبادت یا نہانے، یا کھانے کے وقت ان کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ 'برسم گزار' اور 'زمزم سرائے' آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست بَرسَم ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔

در کینہ ورزی، تفسیدہ دشتے   در مہربانی، بستاں سرائے

تفسیدہ دشت تپتا ہوا صحرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلفِ پُرخم، مشکیں نقابے　　　از تابشِ تن زریں ردائے

یعنی زلفِ پُرخم اس کے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے، وہ بدن کی چمک دمک سے سنہرا معلوم ہوتا ہے۔

در عرضِ دعوے، لیلیٰ نکوہے　　　بر رغمِ غالب، مجنوں ستائے

یعنی جب دعویٔ حسن و جمال کرتا ہے، تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے۔ اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشقِ صادق تھا۔

عاشقانہ

توکے زجور پشیماں شدی، چہ می گوئی　　　دروغِ راست نمائی کہ داشتی، داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیمان ہو گیا ہوں" تو کب پشیمان ہوا ہے؟ کیوں کہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو، جیسا تو پہلے بولتا تھا، اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیمان ہوں، یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

عاشقانہ

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی و باز　　　نگاہِ مہر فزائے کہ داشتی، داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے، پھر بھی کسی کافر کے ساتھو نہ گزرتی ہوگی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھ کر کون سے گنہگار کی قیامت کا دن ہے، بتا تو سہی؟

غزل مسلسل عاشقانہ

ایکہ گفتم؛ ندہی دادِ دل، آرے ندہی　　　تاچو من دل بنہاں شیوہ نگاہے ندہی
چشمۂ نوش ہمانا نترادد ز دلے　　　کش نگیری و در اندیشہ فشارے ندہی

کہتا ہے کہ اس دل سے یقیناً چشمۂ نوش نہیں ٹپک سکتا جس کو کہ تو بھینچ کر تصور میں فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشقِ مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اس میں نہیں اٹھاتا اس میں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند　　　تو کہ باشی کہ بخود زحمتِ کارے ندہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جائے۔

سر براہِ دمِ شمشیرِ جوانے نہ ہی تن بہ بندِ خمِ فتراکِ سوارے ندہی
خوں بذوقِ غمِ یزداں نشناسے نخوری دیں بمہرِ حقِ الفت مگذارے ندہی

یزداں نشناس اور حقِ الفت مگذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخر کار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرد کفِ خونے کہ بداں زینتِ دارے ندہی

فسرد، فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن، ٹھٹھر جانا، خشک ہو جانا یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نہ کرے، مرنے کے بعد بدن میں خشک ہو کر رہ جائے گا۔

حیف گر تن بسگانِ سرِ کوئے ندہد وائے گر جاں بسرِ راہ گذارے ندہی
رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند نقدِ ہوشے کہ بسودائے بہارے ندہی
بخمِ طرّۂ حورانِ بہشت آویزند ناز پروردہ دلے را کہ بیارے ندہی
گر تنزل نہ بود، ابرِ بہاری، غالب! کہ دُر افشانی و زافشاندہ شمارے ندہی

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسرِ شان نہ ہو، تو اے غالب، تیری مثال ابرِ بہاری کی سی ہے کہ موتی برساتا ہے اور اس کی گنتی نہیں بتاتا، یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔

تصوف

دریا ز حباب آبلہ پائے طلب ہست نورِ نظر اے گوہرِ نایاب! کجائی
شوریست نواریزیِ تارِ نفسم را پیدا نۂ اے جنبشِ مضراب! کجائی

یعنی میرے تارِ نفس سے شعلے نکل رہے ہیں، انھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے، مگر اے جنبشِ مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے، تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

فخریہ

بنمائے بہ گوسالہ پرستاں یدِ بیضا غالب بہ سخن صاحبِ فرتاب! کجائی؟

فرتاب، کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العیار شاعروں کو مانتے ہیں۔

تصوف

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آزری

'دیدہ ور' یعنی صاحبِ نظر، وہ شخص ہے کہ جب اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں

کون سی چیزیں دل کش و دل رُبا ہیں، تو وہ ان گھڑ پتھر کے اندر بتانِ آذری کو رقص کرتے ہوئے دیکھے یعنی مادے میں جو قابلیت اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اُس پر ظاہر ہو جائے۔

تصوف

اے تو کہ ہیچ ذرہ را، جز بہ رہِ تو روی نیست   در طلبت تواں گرفت، بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جنابِ احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرّے کو دیکھیے اس کا منہ تیرے ہی رستے کی طرف پھرا ہوا ہے اور اس لیے تیری راہِ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تصوف

ہر کہ دلست در برش، داغِ تو رویدش ز دل   تا چو بدیگرے دہد، باز بری بداوری

کہتا ہے کہ جس کے پہلو میں دل ہے، اس کے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے؛ اور یہ اس لیے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگا لے، تو اس حجت سے کہ تیری نشانی اس پر موجود ہے، وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری، جھگڑا، ٹنٹا اور حجت۔

تصوف

رشک ملک چہ و چرا؟ چوں بتو رہ نمی برد   بیہدہ در ہوائے تو می پرّد از سبکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جب کہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

تصوف

حیف کہ من بخوں تپم، وز تو سخن رود کہ تو   اشک بدیدہ بشمری، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

زار نالی

کوثر اگر بمن رسد، خاک خورم ز بے نمی   طوبیٰ اگر ز من شود، ہیمہ کشم ز بے بری

یعنی میری شومیِ بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھ کو مل جائے تو اس میں نمی باقی نہ رہے اور مجھے اس سے خاک کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور اگر طوبیٰ میری ملک ہو جائے

تو وہ ایسا بے بر ہو جائے کہ اس کی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

حالتِ فکرِ شعر

بینیم از گدازِ دل، در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بضمیرِ من بری

کہتا ہے کہ اگر فکرِ شعر کے وقت تو میری حالتِ دروں کو ٹٹولے تو دل کے گداز سے ایک آگ کی رَو بہتی ہوئی تجھ کو نظر آئے۔ یہ اس جوش اور اس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہ ہوں گے، ان میں سے کسی قدر اشعار جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے، بطور نمونے کے یہاں نقل کر دیے گئے ہیں، تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اوّل سے آخر تک بنظرِ غور دیکھیں، وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھ کر اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ مرزا کی غزل شعرائے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے! اور ان کی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں کی غزلوں کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب وغیرہ۔ مگر چوں کہ اس مختصر میں زیادہ گنجایش نہیں، اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی بھی نہیں معلوم ہوتی اس لیے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے کہ اس وقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں، کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل پا خفتست اور بلا خفتست ہے، مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے، جس میں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا۔ اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے۔ اس لیے مرزا کی غزل میں سے بھی اوّل صرف آٹھ بیتیں لی جائیں گی، تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے اور بعد موازنے کے باقی اشعار بھی نقل کر دیے جاویں گے۔

نظیری	غالب
نظر بظاہر و صیاد در خفا خفتست	بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفتست
اجل رسیدہ چہ داند، بلا کجا خفتست	بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعۃً پیدا ہو جاتا ہے جس کا سان گمان تک نہیں ہوتا، ایک معمولی حالت کے پیرایے میں جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گزرتی رہتی ہے، بیان کیا ہے۔ نظیری کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، بہت صاف اور نیچرل ہے۔ اور گو یہ مطلع اس کے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا، لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر ان کی زندگی میں "عصا خفتست" کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے:

ولے بحملۂ اول عصاے پیر بخفت

مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، کیوں کہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتن" سے جو معنی اُس نے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں، ان کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا، بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک یہ نہ جتایا جاوے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لیے ہیں، تب تک اس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری	غالب
کجا ز عشوۂ آں چشمِ نیم باز رہیم	دگر ز ایمنیِ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پاے ما خفتست	مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اٹھا ہو اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اس کے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہ ہو، اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور ہمارا پاؤں سو گیا ہے۔ پس اس کی چشم نیم باز کے عشوے سے کیوں کر رہائی ہو گی

مرزا مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزلِ مقصود قریب

ہو، مگر نہ مسافر میں، نہ اس کی سواری میں آگے قدم اٹھانے کی طاقت ہو، اس طرح بیان کرتے ہیں "دگر ز ایمنیِ راہ الخ" ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں، وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کریں گے۔ مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے، اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے، اس کا مصداق ہو سکتا ہے، یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری	**غالب**
کسی بہ قلبِ شبم تُرکتاز می آرد	غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگہِ خلق
کہ بر فراشِ قصب پاے درحنا خفتست	عَسس بخانہ وشہ درحرم سرا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اوّل اس کو سوجھا ہے، مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے۔ کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر ڈاکا ڈالتا ہے، جو ریشمی بچھونوں میں، پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا تصور اور اس کا خیال، بغیر اس کے کہ اس کو اطلاع ہو، رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخون مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محل سرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر کی وجہ پیدا ہوا ہے، مگر مرزا کی غیر معمولی اُپج اور بلند پروازی کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری	**غالب**
شمیمِ مہر ز باغِ وفا نمی آید	ببیں ز دُور و مجو قربِ شہ کہ منظر را
بہر چمن کہ تو بشگفتۂ صبا خفتست	دریچہ بازو بدروازہ اژدہا خفتست

اگرچہ مآل دونوں شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔

نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوقِ حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے یعنی اس کو اہتزاز مطلق نہیں ہے، جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اس کو دور ہی سے دیکھ لو، اور "قربِ شاہ" یعنی ذاتِ بحت کی تلاش مت کرو، کیوں کہ اگر چہ جھروکے کے پٹ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اُس کے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیوں کہ عین دروازے پر اژدھا سوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونوں کا یہ ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

نظیری

طبیبِ عشق برد طمع ز بیمارے
کہ شب براحت ازیں دردِ بے دوا خفتست

غالب

بصبحِ حشر چنیں خستہ رُوسیہ خیزد
کہ در شکایتِ درد و غمِ دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طبیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے کہ جو کسی رات کو اس دردِ بے دوا یعنی عشق کی بے چینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو؛ گویا مریضِ عشق کی علامت محو دیہی ہے کہ اس کو کبھی راحت نصیب نہ ہو۔ مگر شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے۔ حال آنکہ عاشقِ صادق کی علامت یہی ہے کہ اس کو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہ ہو، بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عین راحت معلوم ہو۔ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشقِ صادق وہی ہے، جو ہمیشہ بے چینی اور بے قراری میں بسر کرے۔ اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اس کی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لیے اس مضمون کو الٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن رُوسیاہ اٹھے، جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

نظیری

کس از معانقۂ روزِ وصل یابد ذوق

غالب

درازیِ شبِ بیداریِ من از انیہم نیست

کہ چند شب زہم آغوشِ خود جدا خفتست   زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس آن کی جگہ لایا ہے۔ معانقۂ روزِ وصل، وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شبِ ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں ہے۔ ہاں، یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؟ کیوں کہ رات کی درازی، اور میری بیداری اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں سب اسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور عالی ہے، اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اس میں اَن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری	**غالب**
شبِ امید بہ از روزِ عید می گزرد	بدیں نیاز کہ با تست نازِ می رسدم
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست	گدا بہ سایۂ دیوارِ پادشا خفتست

نظیری کا شعر اس کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے، بلکہ اس کے سارے دیوان کے اُن ۷۲ نشتروں میں سے ایک نشتر ہے، جو اساتذہ نے اس کی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کر سکتا، مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکالنا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو جو تیری جناب میں نیاز ہے، اس پر مجھ کو ایسا ہی ناز ہے جیسا اس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سایے میں پڑا ہو۔

نظیری	**غالب**
فسانہ صرفِ نظیری مکن کہ خواب کند	بخواب چوں خودم آسودہ دل بداں غالب
شکستۂ کہ بصد درد مبتلا خفتست	کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سُنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) [illegible] مبتلا ہو کر

پڑ رہا ہے، وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب! مجھ کو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیوں کہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو سوتے جاگتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دونوں غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں، جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار، جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں، لکھتے ہیں۔

خروشِ حلقۂ رنداں ز نازنیں پسریست کہ سر بہ زانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
دلم بسُبحہ و سجّادہ و ردا لرزد کہ دزدِ مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
براہ خفتنِ من ہر کہ بنگرد، داند کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے، اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد کے تینوں شعر ہم تے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے اور پچھلے دونوں شعر بھی نظیری کی غزل کے عام اشعار سے رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے، تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونوں غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں؛ ورنہ انصاف یہی ہے کہ ہیأتِ مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لے جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے۔ نظیری وہ شخص ہے جس کی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں:

“صائب! چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را”

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں

ہمچشمی نظیری حدِ بشر نباشد

اور شیخ ابوالفضل آئینِ اکبری میں اس کی نسبت لکھتے ہیں:

درے از نزہتگاہِ معنی بروئے کشودہ اند

پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا، اس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی، جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو کیوں کہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں، جو ان کے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی زمینوں میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لے جانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں؛

شبِ فراق چہ داند کہ تا سحر چنداست   مگر کسیکہ بہ زندانِ عشق در بندست

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں، مگر چوں کہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا تتبع ظاہر کرتے ہیں، اس لیے اس کی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب، اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے، جس کے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیے گئے ہیں اور اس کے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخے سے بھی کر لیا گیا ہے؛ اس لیے وہی غزل موازنے کے لیے انتخاب کی گئی ہے اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے، اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں، جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے؛ اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی دس دس بیت کی ہیں۔

ظہوری

بعشق قابلِ دیوانگی خردمندست
ببُرز جملہ کہ آزاد، مردِ ایں بندست

غالب

چو صبحِ من ز سیاہی بشام ماندست
چگویم کز شب چند رفت یا چندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے، اسی کو خردمند سمجھنا چاہیے۔ پس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے، کیوں کہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے، وہی بندِ عشق کا مرد (یعنی اس کے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جب کہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھ سے یہ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گزری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی چھائی رہتی ہے۔ پس مجھے کیا خبر کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے۔ ظہوری کے شعر میں اس کے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعتِ تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خرد مندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

ظہوری

بشکرِ دیدۂ تر، تر زبانیے دارم
کہ زہرِ گریہ طراوت دہِ شکر خندست

غالب

نگاہِ مہر بہ دل سر ندادہ چشمۂ نوش
ہنوز عیش باندازۂ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں کیوں کہ گریے کا زہر معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اس کو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو ترو تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے، مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی، جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اس کی نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اس کے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور تر زبانی یا زہرِ گریہ اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں، مگر مرزا کا شعر اس سے زیادہ بلیغ نیچرل اور

عاشقانہ ہے۔

ظہوری	غالب
مگر کہ رخصتِ بے طاقتی شود مرہم	نہ گفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر
کہ گوشِ دل شدگاں ریشِ گشتۂ پندست	بروکہ بادۂ ما تلخ ترازیں پندست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگان (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصحوں کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے۔ ان کے اس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو بے طاقتی (یعنی دل تنگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہا کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کر لے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا، اپنا رستہ لے، ہماری شراب اس نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، پس ہم کو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری	غالب
چہ غم کہ عہد گسل دارد ت کشاکشِ ناز	درازدستیِ من چاکی ار فگند، چہ عیب؟
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوندست	ز پیش، دلقِ ورع با ہزار پیوندست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھ سے عہد شکنی کراتی رہتی ہے، تو کچھ افسوس کی بات نہیں کیوں کہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے، اسی قدر پیوندِ عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی او بے باکی و رندمشربی نے دلقِ ورع و تقویٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے، تو میرا چنداں قصور نہیں ہے کیوں کہ اس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں۔ یعنی خود اہلِ ورع و تقویٰ ہی اس کی دھجیاں اڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اس کا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے، جو

کی قسم کھاتا ہے، جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت ا نزاکت پائی جاتی ہے رقیب کے نصیب کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ جو وجود سر[illegible]ن وجمال ہے وہ بالکل اُسی کے حصّے میں آگیا ہے، اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اس کے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بن گیا ہے۔ اس کے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا، اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری	غالب
زرہروانِ تو منزل شمار را کہ شمرد	شمارِ کجرویِ دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نمیداند اندہش چند ست	دریں نورد ندانم کہ آسماں چند ست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے، اس کو تیرے رہرووں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسے ست" یعنی غم معشوق اس شخص کا حصہ ہے جس کو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کتنی شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے، مگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری	غالب
شود گسستہ بایام، اگرچہ زنجیر است	بہ رنج از پے راحت نگاہ داشتہ اند
اسیر آنکہ بہ تارِ نگاہ دربند ست	زحکمت است کہ پای شکستہ دربند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے۔ پس درحقیقت قیدی وہی ہے، جو نگاہِ معشوق میں الجھا ہوا ہے، جس کو قید سے کبھی رہائی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ ہماں تکلیف میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو؛ اور اس کی مثال یہ ہے کہ پاشکستہ آدمی کو چلنے پھرنے نہیں دیتے اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اس کو راحت

حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے، مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے۔ مرزا کے یہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے، مگر بیان نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری	غالب
زبندگان نسزد آرزو، خدا نکند	اگر نہ بہرِ من، از بہرِ خود عزیزم دار
ہمیں بس ست کہ ما بندہ، اُو خداوند ست	کہ بندہ خوبیِ او خوبیِ خداوند ست

ظہوری کے شعر میں "خدا نکند" یا تو محض حشو ہے یا اس کے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا نکند کو ما آرزو بکنیم"، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معنیً اور لفظاً دونوں طرح ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

ظہوری	غالب
اسیرِ عشق ظہوری! نشانہ دارد	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
نشانہ اینکہ بہ بیدادِ دوست خُرسند ست	بدیں کہ پُرسد و گویند ہست، خُرسند ست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیرِ عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔

مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہلِ دنیا سے وفا کا طالب ہوں، بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ "دنیا میں وفا ہے؟" اور وہ لوگ اس کے جواب میں کہیں کہ "ہاں، ہے"۔ دونوں مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اس کے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں۔

ہم نے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کر دی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں گے، اس بات کا اندازہ کر لیں گے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیات تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جن میں سے اکثر شوخی و بے باکی، بادہ خواری، فخر و مباہات اور شکایت و زار نالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر متصوفانہ اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں۔ خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اس کی شرح بھی کر دی جائے گی۔

فخریہ

غالب بہ گہر ز دودۂ زاد شمم (۱) زاں رُو بصفائی، دمِ تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی، زدم چنگ بشعر شد تیرِ شکستۂ نیاگاں، قلمم

گہر، گوہر، اصل، دودہ، نسل و خاندان۔ زادشم، پشنگ کے باپ اور تور ابن فریدوں کے بیٹے کا نام ہے، جس کی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دمِ تیغ، تلوار کی دھار۔ دم یعنی میرا کلام۔ سپہبدی، سلطنت و سپہ سالاری۔ نیا، دادا؛ نیاگان جمع۔ کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہو گئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کر لیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

تفضیل

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب و رسوم (۲) خیزد بعد از نبی، امام معصوم
ناجامع چہ گوئی، بہ علی باز گرائے مہ جانشینِ مہر باشد، نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر کیوں کہ خلفائے ثلٰثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کر سکتے۔

تصوف

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ (۳) خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشانہا دارد سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے، خواہ اس کو دراز سمجھو، خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ جو کوثر و طوبیٰ ہیں جن میں اس کی راہ کے کچھ کچھ نشان پائے جاتے ہیں، یہ ایسے ہیں جیسے اثنائے راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے۔

شوخی

آں مرد کہ زن گرفت، دانا نہ بود (۴) از غصہ فراغتش، ہمانا نہ بود
وارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو   نازم بخدا، چرا توانا نہ بود

تیسرے مصرعے میں وارد کا فاعل خدا ہے، جس کا نام چوتھے مصرعے میں لیا ہے۔ خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

شوخی

با دست غم آں باد کہ حاصل ببرد (۵) آبِ رُخِ ہوشمند و غافل ببرد
بگذاشتہ ام خُمے ز صہبا بہ پسر   کش اندوہِ مرگِ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا کر لے جائے، اور دانا اور نادان کی آبرو کو بہا لے جائے۔ اسی لیے میں بیٹے کے لیے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اس کے دل سے دھو دے۔

شوخی

اے آنکہ بہ رہِ کعبہ رُوے داری (۶) نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تند می خرامی، دانم   در خانہ زنِ ستیزہ خوے داری

کعبے جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بدمزاج عورت ہے جس کے سبب سے کعبے جانے میں اس قدر جلدی ہے۔

فخریہ

شاہا! ہر چند واپہ جُو آمدہ ام (۷) دانی کہ چہ مایہ نغز گو آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ نمو آمدہ ام   آبم کہ محیط را بجو آمدہ ام

بے تعلقی

زانجا کہ دلم بو ہم در بند نبود (۸) با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصودِ من از کعبہ و آہنگِ سفر   جز ترکِ دیارِ زن و فرزند نبود

یعنی چوں کہ میں وہم میں، جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے، گرفتار نہ تھا، اسی لیے کعبے کے عزمِ سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عاشقانہ

اے جامِ شراب شادکامی زدہ (۹) در جور دم از بلند نامی زدہ
یاد آر ز من چو بینی اندر راہے تنہا رہِ خستہ حرامی زدہ

حرامی، قزاق۔ حرامی زدہ، قزاقوں کا لوٹا ہوا۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور اپنی حالت کو اس مسافر سے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور قزاقوں نے اسے لوٹ لیا، گویا معشوق کو قزاق ٹھیرایا ہے۔

شوخی

اے آنکہ ترا سعی بہ درمانِ من ست (۱۰) منعم مکن از بادہ کہ نقصانِ من ست
حیف ست کہ بعدِ من بہ میراث رود ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ من ست

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں مر گیا تو غضب ہو جائے گا، کہ یہ اکٹھے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئیں گے، میرے وارثوں کو پہنچ جائیں گے۔

شکوۂ روزگار

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دہر (۱۱) ریزد ہمہ دُرد درد و تلخ آبۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بہ غمزہ کشت و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں قسم کے ستارے نحس ہو گئے کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

افسوس بر وفات مومن خان

شرطست کہ بہ روی دل خراشم ہمہ عمر (۱۲) خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

ترکِ مراد

غالب روشِ مردمِ آزاد جداست (۱۳) رفتارِ اسیرانِ رہ و زاد جداست

ما ترکِ مراد را اِرَم مے دانیم   واں باغچہ ضبطیِ شدّاد جداست

یعنی آزاد لوگوں کی اور روش ہے اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں، ان کا اور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں، ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام اِرَم ہے اور وہ اِرَم جس سے شدّاد محروم رکھا گیا، وہ ہمارے اِرَم سے الگ ہے۔

شکریہ رسیدِ نامہ

ایں نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد (۱۴) سرمایۂ آبروے درویش آورد
در ہر بُنِ مُو دمید جانے یعنی   سامانِ نثارِ خویش با خویش آورد

تصوف

منصور غمش ز نکتہ چیناں چہ بود (۱۵) در راست خطر ز ہمنشیناں چہ بود
چوں عاقبتِ یگانہ بیناں دار است   دریاب کہ انجامِ دو بیناں چہ بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پہ چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا، تو منصور کو اس کی کچھ پروا نہیں۔ مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بین لوگوں کا انجام دار ہے، تو دو بینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

شوخی

ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است (۱۶) بر خاکِ رہِ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا اِرَم بہ دعوے طلبد   شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے، اس کو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شدّاد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا کیوں کہ اوّل تو ارم جو کہ متروکہ شدّاد ہے اس کا دعویٰ کرنا اور پھر خدا کے سامنے اس کے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شدّاد نے اپنا وارثِ حقیقی چھوڑا تھا۔

شوخی

غالب بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست (۱۷) از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار   ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

کہتا ہے کہ اے غالب! اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے

دماغ میں بالکل نہیں ہے؛ شراب چاہتا ہے اور وہ بھی مفت اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے! یہ بادہ فروش ہے ساقیِ کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کردے گا۔

شوخی

گردیدنِ زاہداں بجنت گستاخ (۱۸) ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ
چوں نیک نظر کنی، ز روے تشبیہ ماند بہ بہائم و علف زارِ فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بے باک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لیے ہاتھ مارنا" اگر غور کرکے دیکھو، تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس میں ڈھور ڈنگر چرتے پھرتے ہیں۔

اخلاق

آں را کہ بود درستیے در فرجام (۱۹) ہم محرمِ خاص آید و ہم مرجعِ عام
آساں نہ بود کشاکشِ پاسِ قبول زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام!

فرجام، انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جس کی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے، وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاسِ قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے، نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور ہونا نہیں چاہیے۔ اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے، جس سے ساری رباعی میں جان پڑ گئی ہے۔

شوخی

درعالمِ بے زری کہ تلخ ست حیات (۲۰) طاعت نتواں کرد بہ امیدِ نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ بودے بوجودِ مال، چوں حج و زکوٰۃ

کہتا ہے کہ بے مقدوری کی حالت میں جب کہ زندگی تلخ ہوتی ہے، نجات کی امید پر طاعت نہیں ہو سکتی۔ کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تموّل شرط ہے، روزے اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

شکایت ابنائے زماں

ہر چند زمانہ مجمعِ جہّال ست (۲۱) در جہل ز حالِ شاں یکے منوال ست
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجّال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جہلا جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں ان کا حال متفاوت و مختلف ہے۔ کودن تو سب ہیں، مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرِ عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

میکش و جوہر

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم (۲۲) شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست — در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین میکش کے حق میں کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے، لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم یعنی پیرِ مغانیم۔ باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

فخریہ

دستم بہ کلیدِ مخزنے بایست (۲۳) ور بود تہی بدامنے می بایست
یا ہیچ گہم بہ کس نیفتادے کار — یا خود بزمانہ چوں منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہیے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو اس میں کسی کا دامن ہونا چاہیے تھا، جس کے توسّل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحبِ کمال ہوتا، جو میری قدر کرتا۔

اُمیدِ عفو

بستم نیے امید سرمست و بس ست (۲۴) دارم سرِ ایں کلاوہ در دست و بس ست
گر ارزشِ لطف و کرمے نیست مباش! — استحقاقِ ترحمے ہست و بس ست

سرِ ایں کلاوہ یعنی سرِ ایں رشتہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔

خطاب با غنیا

گر گرد ز گنجِ گوہرے برخیزد (۲۵) مپسند کہ دود از جگرے برخیزد
منت نتواں نہاد بر گدیہ گراں — بنشیں کہ بخدمت دگرے برخیزد

گنجِ گوہر سے گرد اٹھنے کے معنی اس کے خالی ہو جانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہو جائے تو بلا سے، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دھواں اٹھے۔ بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا۔ خدا نے اُن کی خدمت پر تجھ کو کھڑا کیا ہے۔ اگر تجھ

سے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اس خدمت کے لیے اٹھے۔

عاشقانہ

اے دوست بسوی ایں فرو ماندہ بیا (۲۶) از کوچۂ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام   بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

اوپر کے دونوں مصرعے صاف ہیں۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تو نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے مت بلانا میں تیری موت ہوں۔ اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ، اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے، تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیرِ دامت باشد (۲۷) صاحب بے خسروی بجامت باشد
تسبیح بہرِ اسمِ الٰہی کہ بود   آغاز ز ابتدائے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علی خان مرحوم کو جو مرزا نے خط لکھا تھا، اس کے اول میں لکھی تھی۔ معنی ظاہر ہیں۔

امیدے،

بازیِ خورِ روزگار بودم ہمہ عمر (۲۸) از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بفکرِ سود ماندم ہمہ جا   بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

خطاب با منعما

باید کہ دلت ز غصہ برہم نشود (۲۹) از رفتنِ زر، دست خوشِ غم نشود
ایں سیم و زر است خواجہ! ایں سیم و زر است   غم نیست کہ ہر چند خوری، کم نشود

دست خوش، مغلوب و زیر دست۔ کہتا ہے کہ اے دولت مند! چاہیے کہ روپے کے کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا نہ رہے۔ اے حضرت، یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر ہے، یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے، کم نہیں ہوتا۔

گرانی گوش

دارم دلِ شاد و دیدہ بینائے (۳۰) وز کریِ گوشم نبود پروائے
خوب ست کہ نشنوم ز ہر خود رائے   گلبانگِ انا ربکم الاعلائے

کہتا ہے کہ مجھ کو کریِ گوش یعنی ثقلِ سماعت کی کچھ پروا نہیں، البتہ اس کو بہتر

سمجھتا ہوں کیوں کہ مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے اَنَا ربکم الاعلیٰ (جوکہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

توحیدِ وجودی

اے کردہ بآرایشِ گفتار بسیچ (۳۱) در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم و پیچ
عالم کہ تو چیزے دگرش میدانی ذاتے ست بسیط منبسط، دیگر ہیچ

بسیچ، قصد۔ زلفِ سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی۔ کہتا ہے کہ عالم جس کو تو نے کچھ چیز سمجھ رکھا ہے، وہ صرف ذاتِ واحد ہے، جو بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے، بس اس کے سوا کچھ نہیں۔

شکایت

اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بسترِ من (۳۲) ہر خاک کہ باتست، ہمہ بر سرِ من
زر بہرِ کسان و بہرِ من دانہ و دام اے مادرِ دیگراں و مادندرِ من

مادندر، سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لیے تو تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے اور میرے لیے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں؛ گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری میندر ہے۔ یہ مضمون تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے۔ رودکی کہتا ہے:

جہانا! چہ بینی تو از بچگاں کہ مادر گہے، گاہ مادندری

اور فرخی کہتا ہے:

مہرِ فرزندی برخواجہ فگندہ ست جہاں ایں جہاں مادرِ او نیست کہ مادندرِ اوست

رسوائی

آں را کہ ز دست بے زری پامال ست (۳۳) رسوائی نیز لازمِ احوال ست
ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے کہ مفلس آدمی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چناں چہ ہم کو دیکھو کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں۔ گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام

اور رسوا ہو جاتا ہے کیوں کہ کبھی کلال کی دکان پر جا کر ہاتھ پسارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بدمست ہو کر اس کی دکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے، آنے جانے والے سب اس کو دیکھتے ہیں۔ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں، تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے، اور سب لوگ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی اس کو اطمینان سے سیر ہو کر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقیِ تقدیر ہم کو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شرابور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔

علت غائی جہنم

اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس (۳۴) زنہار مشو ز رحمتِ حق مایوس
ہشدار! اگر آتشِ جہنم حق را تہذیب غرض بود نہ تعذیبِ نفوس

فسوس، ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے، بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اس کی کھوٹ نکالنی مقصود ہوتی ہے، اسی طرح آتشِ جہنم سے نفوسِ انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

شوخی

یارب تو کجائی کہ بما زر نہ دہی (۳۵) بیدرد خدائی کہ بما زر نہ دہی
نے نے، تو نہ غائبی و نے بیرحمی بے مایہ چو مائی کہ بما زر نہ دہی

اس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوش حالی و بدحالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے، اور تدبیر و عقل و دانش کو اس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہم نے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھ سے غلطی ہو گئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگ دستی ہم کو نصیب ہوئی، بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا

ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہو گیا ہے، جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؟ ہاں اس قسم کے خطابات آدابِ شریعت کے بالکل خلاف ہیں، اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے:

ما بروں را ننگریم و قال را
ما دروں را بنگریم و حال را

قصائد

مرزا کے قصائد، جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبارِ کمیّت اور کیا بلحاظ کیفیت کے ان کے اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتد بہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت استاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں ہے، بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جس میں تغزل کی شان یعنی عام فہم اور خاص پسند ہونا، بہت کم پایا جاتا ہے۔ بخلاف قصیدے کے کہ اس میں قصیدے کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے، اول سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا، اور کہیں عرفی۔ نظیری کا؛ اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بنسبت مدح کے نہایت شاندار و عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا، سیٹھا، ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا۔ علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی لے کو بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے اور اس کلیے سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ بالغور میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اس سے معرا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیب

کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیہوں سے سبقت لے گئی ہیں۔

چوں کہ مرزا کے تمام قصائد اور ان کے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجایش نہیں ہے۔ اس لیے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کریں گے تاکہ اصحابِ ذوقِ صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقے کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

انتخاب از قصیدۂ توحیدِ الٰہی

اے ز وہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ   گفتہ خود حرفے و خود را در گمان انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پرداختہ   پردۂ رسمِ پرستش در میان انداختہ
نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ   شور در عالم ز حسنِ بے نشان انداختہ
چرخ را در قالبِ ابداع دَر دَوار ریختہ   خاک را بر نطعِ پیدائی ستان انداختہ
عاشقاں در موقفِ دار و رسن واداشتہ   غازیاں در معرضِ تیغ و سنان انداختہ
رنگہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ   نکتہا در خاطرِ اہلِ بیان انداختہ
با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی   مردہ را از خویش دریا بر کران انداختہ

دوئی کو مُردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح دریا مُردے کو باہر پھینک دیتا ہے، اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبانے بستہ با دیوارِ کاخے در نظر   انتعاشے در نہادِ این و آن انداختہ
رفتہ ہر کس تا قدمگاہے و زانجا خویش را   پایہ پایہ از فرازِ نردبان انداختہ
غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد   بہرِ آسانی اساسِ آسمان انداختہ
گل چو ماند دیر گردد بر دلش بازار سرد   بہرِ تجدیدِ طرب طرحِ خزان انداختہ
آتشے از رُوئے گلہائے بہار افروختہ   شعلۂ در جانِ مرغِ صبح خوان انداختہ
دجلۂ در ساغرِ معنی طرازاں ریختہ   رشحۂ در کاسۂ دریا دکان انداختہ
جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد   کعبہ را جوئے بہشت از ناودان انداختہ

جز بدیں الماس نتواں ہمچنیں دُردانہ سُفت   رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ

یعنی آتشِ زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی، اس لیے میزابِ کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور کیشِ مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اس کا بیندھنا، یعنی اس میں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشم را بخشیدہ چوناں گردشے کارباب ہوش   بر زمیں دانند طرحِ آسماں انداختہ
دادہ ابرو را بد انساں جنبشے کاہلِ قیاس   در تنِ شمشیر پندارند جاں انداختہ
ای ز شرمِ خاکسارانِ تو، از شہپرِ ہما   چوں گلیمِ کہنہ ظل را بر کراں انداختہ
ذوقِ تمکینِ گدایانِ تو، گنجِ شاہ را   از دلِ گنجور و چشمِ پاسباں انداختہ
تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود   دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ
تا علاجِ خستگی آسایشِ دیگر دہد   خارہا در رہگذارِ میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

منقبت از قصیدۂ سید الشہدا

کفرست کفر، در پئے روزی شافتن   ننگ ست ننگ، در غمِ دنیا گریستن
گاہے بداغِ شاہد و ساقی گداختن   گاہے بمرگِ مامک و بابا گریستن
باید بدردِ ہرزہ گرستن، وگر گریست   بیجا گریستیم، دریغا گریستن!
رشک آیدم بہ ابر کہ در حدّ وسعِ اوست   بر خاکِ کربلاے معلےٰ گریستن
رفت آنچہ رفت۔ بایدم اکنوں نگاہداشت   از بہرِ نورِ دیدۂ زہرا گریستن
بارانِ رحمتے، کہ بانداز شُست و شو[۲]   دارد بہ رُوسیاہیِ اعدا گریستن
خود را ندیدہ زاں لبِ نوشیں بکامِ خویش   زیبد بہ شور بختیِ دریا گریستن
مزدِ شفاعت و صلۂ صبر و خوں بہا   ہیچ از کسے نخواستہ اِلّا گریستن
چوں رزقِ غیب درد ترا عام کردہ اند   سر می زند ز مومن و ترسا گریستن

نوحہ

اے فلک شرم از ستم بر خاندانِ مصطفےٰ   داشتی زیں بیش سر بر آستانِ مصطفےٰ
اے بمہر و ماہ نازاں، ہیچ میدانی، چہ رفت   از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفےٰ
سایہ از سروِ روانِ مصطفےٰ نفتد بخاک   ہاں، چہ بر خاک افگنی سروِ روانِ مصطفےٰ
گرمیِ بازارِ امکاں خود طفیلِ مصطفےٰ است   بیں، چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ

کینہ خواہی بیں کہ با اولادِ امجادش کنی　　آنچہ با مہ کردہ اعجازِ بنانِ مصطفےٰ
نیک نبود کز تو بر فرزندِ دلبندش رود　　آنچہ رفت از مرتضیٰ بر دشمنانِ مصطفےٰ
یا تو دانی مصطفےٰ را فارغ از رنجِ حسین　　یا تو خواہی زیں مصیبت امتحانِ مصطفےٰ
یا مگر گاہے ندیدی مصطفےٰ را با حسین!　　یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفےٰ
آں حسین ست اینکہ گفتے مصطفےٰ "روحی فداک"　　چوں گزشتے نامِ پاکش بر زبانِ مصطفےٰ
آں حسین ست اینکہ سودے مصطفےٰ چشمش برخ　　بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفےٰ
قدسیاں را نطقِ من آوردہ غالب! در سماع　　گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوانِ مصطفےٰ

نوحہ

اے کج اندیشہ فلک! حرمتِ دیں بایستے　　علمِ شاہ نگوں شد، نہ چنیں بایستے
تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند　　عزتِ شاہِ شہیداں بہ ازیں بایستے
حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن بر خاک　　آں کہ جولانگہِ او عرشِ بریں بایستے
حیف باشد کہ ز اعدا دمِ آبے طلبد　　آنکہ سائل بہ درش روحِ امیں بایستے
تازیاں را بہ جگر گوشۂ احمد چہ نزاع　　وطنِ اصلیِ ایں قوم ز چیں بایستے
ایہا القوم! تنزل بود ار خود گویم　　میہماں بے خطر از خنجرِ کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ شام کربلا کا میہماں خنجرِ کیں سے محفوظ رہنا چاہیے تھا، بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے، وہ یہ ہے یعنی جیسا کہ اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن اینست کہ در راہِ حسینؑ ابنِ علیؑ　　پویہ از روے عقیدت بہ جبیں بایستے
چشم بد دور، بہ ہنگامِ تماشاے رخش　　رونما سلطنتِ روی زمیں بایستے
داشت ناخواستہ در شکر قدومش دادن　　اگرش ملک دگر تاج و نگیں بایستے
چوں بفرمانِ خود آرائی و خود بینی و بغض　　آں نکردید کہ از صدق و یقیں بایستے
با اسیرانِ ستمدیدہ پس از قتلِ حسین　　دلِ نرم و منشِ مہر گزیں بایستے
چہ ستیزم بقضا، ورنہ بگویم غالب!　　علمِ شاہ نگوں شد، نہ چنیں بایستے

نوحہ

وقت ست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی　　سوزد نفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی
وقت ست کہ آں پردگیاں، کز رہِ تعظیم　　بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی

از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند   چوں شعلہ دُخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودۂ تشویشِ اسیری   دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہِ رہائی
اے چرخ! چو آں شد دگر از بہرِ چہ گردی؟   اے خاک! چو ایں شد دگر آسودہ چرائی؟
خوں گرد فرو ریز، اگر صاحبِ مہری   برخیز و بخوں غلط، گر از اہلِ وفائی
تنہاست حسین ابن علی در صفِ اعدا   اکبر! تو کجا رفتی و عباس! کجائی؟

قصیدۂ ضریحیہ

بیا در کربلا تا آں ستمکش کارواں بینی   کہ در وے آدمِ آلِ عبا را ساربان بینی
نہ بینی ہیچ بر سر خازنانِ گنجِ عصمت را   مگر در خار بُن[1] ہا تار و پودِ طیلساں[2] بینی
ہمانا سیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریباں را   کہ ہر جا پارۂ از رخت سوزے از دخاں بینی
بہ بینی چشمۂ از آب و چوں جوئی کنارش را   ز خونِ کشتگاں چشمۂ دیگر رواں بینی
بہ بینی سرخوشِ خوابِ عدم عباسِ غازی را   نہ مشکش در خمِ بازو، نہ تیرش در کماں بینی
ہجومِ خستگان و سوز و سازِ نو گرفتاراں   نو آئیں بزمِ طوے قاسمِ ناشادماں بینی
نمی بینی کہ چوں جاں داد از بیدادِ بدخواہاں   علی اکبر کہ ہمچوں بختِ بدخواہش جواں بینی
گرفتم کایں ہمہ بینی دلے داری و چشمے ہم   بخوں آغشتہ نازک پیکرِ اصغر چساں بینی؟
چہ دنداں در جگر افشردہ باشی کاندراں وادی   حسین ابن علی را در شمارِ کشتگاں بینی
نیاری گر در آں کوشی کہ پایش در رکاب آری   نہ بینی گر خود آں خواہی کہ دستش بر عناں بینی
تنے را کش رگِ گل خار بودے بر زمیں یابی   سرے را کش ز افسر عار بودے بر سناں بینی

ستائشِ روزگار

تشبیب قصیدۂ منقبتِ امامِ دوازدہم

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد   آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد
مردست مرد، ہر چہ کند بے خطر کند   دادست راد[3]، ہر چہ دہد رایگاں[4] دہد
گلزار را اگر نہ ثمر، گل بہم نہد   درویش را اگر نہ سحر، شام نان دہد
گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر   وانگہ کلیدِ گنج بدستِ زباں دہد
اندازِ فضا کہ تیرہ نگردد ز رشکِ چرخ   رخشانی ستارہ بہ ریگِ رواں دہد

تا آدمی ملال نگیرد ز یک ہوا   سرما و نوبہار و تموز و خزاں دہد
ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن   تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق   تا آرزوے کام و مرادِ دہاں دہد
آں را کہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست   طبعِ سخن رس و خردِ خردہ داں دہد
آں را کہ بخت دسترسِ بذلِ مال نیست   نعم البدل ز خامۂ پرویں فشاں دہد
دانم کہ آسماں بہ زمیں پیشکارِ کیست   عکسِ چہ جلوہ روشنیِ روشناں دہد
چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور ست   بیداد نبود، آنچہ بما آسماں دہد
رنگ از گل ست و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ   ہر جا بہار، ہر چہ بود درخورِ آں دہد
در نشۂ نغمہ، قرعہ بنامِ ہوا زند   در نشوِ سبزہ، حکم بہ آبِ رواں دہد
ستیز بانسیم، اگر بلبلے بہ باغ   جاں در نوردِ خار و خسِ آشیاں دہد
دارو ز بہرِ زندگی آمد، نہ بہرِ مرگ   جرمِ پزشک چیست اگر خستہ جاں دہد
پرویز دیریاب شہے بود، ورنہ بخت   آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد
فرہاد زود میر کسے بود، ورنہ دہر   کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد
دانم ز روزگار نویدے کہ ایں نوید   در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد
از داورِ زمانہ باندیشۂ درست   شادم کہ مژدۂ بندگیم ناگہاں دہد
ہرگہ بسرنوشت سر آید شمارِ غم   راہم ببارگاہِ شہِ انس و جاں دہد
سلطانِ دیں محمد مہدی کہ راے او   منشورِ روشنی بہ شہِ خاوراں دہد

صفتِ سالکانِ طریقت

تشبیب قصیدۂ مدحِ بہادر شاہ مرحوم

رہروانؑ چوں گہرِ آبلہ پا بینند   پاے را پایہ فراترؔ ز ثریا بینند
ہرچہ در دیدہ عیانست نہانش دانند   ہرچہ در سینہ نہانست، ز سیما بینند
راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند   نقشِ کج بر ورقِ صفحۂ عنقا بینند

یہ شعر گویا ماحصل ہے اس قول کا کہ "لیس فی الامکانِ اَبدَعُ مما کان" یعنی جو نظامِ عالم کہ اب موجود ہے، اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دوربینانِ ازل کوریِ چشمِ بدبیں   ہم دریں جا نگرند آنچہ در آنجا بینند
ازبیں دیدہ وراں جوے کہ از دیدہ وری   نقطہ گر در نظر آرند، سویدا بینند

راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی　　جادہ چوں نبض تپاں در رگِ صحرا بینند
شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست　　زخمۂ کردار بتارِ رگِ خارا بینند
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست　　صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح، نمایاں نگرند　　روز در منظرِ خفاش، ہویدا بینند
وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سنجید　　مجمعِ اُنس بہ نَے بست زلیخا بینند

کاخِ مصوّر وہ محل جس کو زلیخا نے وصالِ یوسف کے لیے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نَے بست وہ جھونپڑا جو یوسف کے قید ہو جانے پر ان کی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اس میں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخِ مصوّر جیسے آراستہ محل میں، اس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخرکار پیدا ہوا اور اُنس اور ملاپ کو اس نَے بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کو اس کے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہر چہ گویند عجم از خسرو و شیریں شنوند　　ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

یعنی خسرو و شیریں کا قصہ جو اہلِ عجم بیان کرتے ہیں، یہ لوگ خود اس کو خسرو اور شیریں کی زبان سے سن لیتے ہیں اور وامق و عذرا کی روداد جو عرب والے بیان کرتے ہیں، یہ لوگ خود اس کو وامق و عذرا پر گزرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستوہند اگر ہمرہِ مجنوں گردند　　نخروشند اگر محملِ لیلیٰ بینند
خوں خورند و جگر از غصہ بہ دنداں گیرند　　خویش را چوں بسرِ مائدہ تنہا بینند

یعنی جب ان کے ساتھ کوئی دوسرا دسترخوان پر نہیں ہوتا، تو دانت پیستے ہیں یعنی جو فیض ان کو پہنچتا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سر و تن را اگر از درد ستوہ انگارند　　جان و دل را اگر از دوست شکیبا بینند
قطرۂ آب بہ لب بوسۂ نشتر شمرند　　پارۂ ناں بہ گلو ریزۂ مینا بینند

یہ دونوں شعر دست و گریباں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دردِ طلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہئے۔

تشنہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند　　بادہ را شمعِ طرب خانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی

چیز سے ازراہِ تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنّار و صلیب   خرقہ و سُبحہ و مسواک و مصلےٰ بینند

برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنّار ہندوؤں کے ساتھ، اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسرے مصرعے میں شعائرِ اسلام کا بیان ہے۔ کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلےٰ وغیرہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں دیرِ دورنگ   ہرچہ بینند بہ عنوانِ تماشا بینند
جام جویند و ز رندی نگرایند بہ زہد   سبحۂ انجم اگر در یدِ بیضا بینند

ہرچہ در دیدہ نتواں یافت بہ ہر سو یابند   ہرچہ در دل نتواں دید بہ ہر جا بینند
ہمہ گردند دراں پایہ کہ او را دانند   ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند

اشعارِ فخریہ

ایں نظرہاے گرانمایہ فراموش کنند   چوں بہ نیرنگِ سخن شعبدۂ ما بینند
نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند   نثر را نسخۂ اعجازِ مسیحا بینند
گر پے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند   گر پے فال بصد رنگ تمنا بینند
بُرد از یاد کہ دنیاست نمودِ بے بود   ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی وجدانی ہے، بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گزرے گی، تو وہ ان کے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کردے گی کہ دنیا محض ایک نمودِ بے بود ہے۔

صفتِ موسمِ بہار

تشبیب قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ

شکر کہ آشوبِ برف و باد سر آمد   نامیہ از بند زمہریر برآمد
کسبِ ہوا نفعِ آبِ خضر رساند   سبزہ جہاں را بہ بیشہ راہبر آمد

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے، جو آبِ حیات کے پینے سے ہوتا ہے؛ اور جس طرح خضر آبِ حیات کا رستہ بتاتا ہے، اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

در چمنستاں کشودہ بارِ نوادر[۵] بادکہ بازرگانِ[۶] بحر و بر آمد
اُشتلمِ انتظارِ گُل بود، ارنہ[۱] دیدۂ نرگس ز حدقہ[۲] چوں[۳] بدر آمد
تا ز چہ دانستہ قربِ مقدمِ گُل را سبزہ بہ باغ از شگوفہ بیشتر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے آیا ہے، اس نے گُل کی آمد آمد کہاں سے سُن لی۔

یمنہ نبود خروشِ مرغِ سحر خواں کوکبۂ[۴] گُل تمز[۵] بباغ در آمد
قیس کجا تا کند شمارۂ محمل از پسِ ہر غنچہ غنچہ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گُل کو لیلیٰ سے تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا محمل نہیں جانتا، وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے کیوں کہ ہر غنچے کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا دَم جڑا نکلتے چلے آتے ہیں۔

کثرتِ انواعِ گُل نگر کہ ہیولیٰ رنجہ ز بارِ فزونیِ صُوَر آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ہیولیٰ بے شمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور تھک گیا ہے۔

لالہ بسیچد ز تیغِ کوہ گذشتن دامنش اینک ز زیرِ سنگ بر آمد

بسیچد یعنی ارادہ کرتا ہے۔ تیغِ کوہ، قلۂ کوہ؛ دامن از زیرِ سنگ بر آمدن مصیبت سے نجات پانا۔

نکہتِ گُل شد وبائے عام جُعَل را زنجرہ ہر شب نہ ہرزہ مویہ گر آمد

جُعَل ایک جانور ہے، سیاہ رنگ جس کو خوشبو راس نہیں؛ اسی لیے موسمِ بہار میں مر جاتا ہے اور چوں کہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے اس کو ہندی میں گبریلا کہتے ہیں۔ زنجرہ، جھینگر جو رات کو اکثر بولتا ہے۔ مویہ گر، نالاں و گریاں۔

میکدۂ خسروِ گُل ست ز رستاں صورتِ مینا ز غورہ در نظر آمد

جام از شرابِ روشنیِ آفتاب داد بزم از بساطِ تازگیِ نوبہار یافت
روئے سخن صفائے بناگوشِ گُل گزید بانگِ قلم نشاطِ نوائے ہزار یافت
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بہ دہر ہر کس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت
فیضِ سحر، بہ غالبِ پیمانہ کش رسید ذوقِ صبوحِ عابدِ شب زندہ دار یافت
رہزن متاعِ خویش بر ابن السبیل ریخت کودک رضائے لہو آموزگار یافت
گر زاہدِ ست نیز ز من مے بجام بُرد در مجرم ست نیز ز شہ زینہار یافت

بافتہ ہم مصالحۂ در خرمی نرفت　　خود رختِ خواہش از رگِ گل پود و تار یافت
دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روے　　ملک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت
از انتظامِ شاہی و آئینِ سروری　　شورِ سرور و دانش و داد انتشار یافت
بر خستگانِ ہند بہ بخشود از کرم　　وکٹوریا کہ رونق ازد روزگار یافت

شکوۂ تغافل و عدمِ توجہ نواب **یوسف علی خان** مرحوم رئیسِ رامپور در زمانہ سختی و بے مائگی
کہ بعد از فتحِ دہلی روزے چند روے دادہ بود

چوں نیست مرا شربتِ آبے ز تو حاصل　　دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل
در بادیہ بر گورِ غریباں ز چہ سوزد　　آں شمعِ فروزاں کہ بود در خورِ محفل
زاں خسروِ خوباں چہ قدر چشمِ وفا بود[1]　　صد حیف کہ شد نقشِ امیدم ہمہ باطل

افسانۂ غم گر بسرایم، نبود عیب　　با دوست کہ پیوستہ ہمی برد غم از دل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن　　خوں می ندہد داد، ز فریاد چہ حاصل
از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار[2]　　دل گفت کہ ہاں، شیوۂ عشاق فرو ہل
تا کس نبرد ظن کہ بہ شاہد بودم رُوے[3]　　حاشا کہ حکایت کنم از لیلیٰ و محمل[4]
شاہد بود آں دوست کہ اندر غزل او را　　خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل
من نالم ازاں دوست کہ در عالمِ انصاف　　شایاں بودش گویم اگر خسروِ عادل
او خسروِ خوباں بود و بندہ گدایش　　او قلزم و عماں بود و من خسِ ساحل
خود ہر چہ سرودم ہمہ با دوست گزیں پیش　　امیدگہم بود بہ ہر وادی و منزل
یا رب! چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من　　بر بستہ بروئیم درِ ارسالِ رسائل
اے یوسفِ ثانی کہ بود در ہمہ عالم　　مشتاقِ جمالِ تو چہ دیوانہ، چہ عاقل
تا نزدِ تو چوں آیم و دور از تو چہ سازم　　ماندن ز تو دشوار و رسیدن بہ تو مشکل
اے کاش، بگوے تو چنیں رُوے نمودے　　زینساں کہ فرو رفتہ مرا پای دریں گل[5]
چوں ست کہ گاہے نکشی رُوے بدیں سوے؟　　از چیست کہ ہرگز ندہی داد بسائل
گر جاں دہم از غصہ، تو دانی کہ بگیتی　　حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل
خواہی کہ مرا بنگری، از دور بفرما　　تا نزدِ تو آرند یکے طائرِ بسمل
از صنعتِ استادِ ازل داں کہ ز ہر سوے　　چوں قبلہ نما سوے توام ساختہ مائل

غالب بسخن نامِ من آمد، ازل آورد[۱]   دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل
در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب   ایں آیۂ خاص ست کہ بر من شدہ نازل
من گنجم و گردوں ز گل اندودہ درم[۲] را   می بیں درِ گنج ارچہ کشودن شدہ مشکل
خود در خورِ ویرانہ بود، گنجِ گراں مند[۳]   غم نیست گر آبادیِ دہلی شدہ زائل
ہاروت فسونِ نفسِ گرم چہ داند   اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل
آں را کہ صریرِ قلم ہوش رُباید   دیگر بَرَد ذوق ز آوازِ عنادل
توقیعِ بتلی[۴] بہ تو فرخندہ کہ من نیز   بستم بہ فرہمندیِ خویش از کرمت دل
حاشا کہ ستانم رقمِ قاضی و مفتی[۵]   حاشا کہ پذیرم عملِ شحنہ و عامل
بفرست خردمند کساں را بحکومت   در جیبِ گدا ریز قلیلے ز مداخل
ہر سال ازاں شہر بمن دایہ رساں بار   کز بہرِ ہمیں گشتہ در اقطاعِ تو شامل
امید کہ لبِ تشنگیِ من نہ پسندی   زاں رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل

زاں رشحہ یعنی مداد۔ مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط و کتابت جاری رہے۔

امید کہ بپذیری و بر من نکنی قہر   نپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
امید کہ اں شیوہ نورزی کہ بگوییم   کز دردِ دلم فارغ و از من شدہ غافل

کیفیتِ آغازِ موسمِ سرما

تشبیب قصیدہ مدح نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک

عید اضحٰے بسرِ آغازِ زمستاں آمد   وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا   محملِ مہرِ جہاں تاب بمیزاں آمد
روز می کاہد و شب راست درافزایش روے   موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد
آذر افروز و خرد اطلس و سیفور بدوز   مہر مہ میرود، اینک مہِ آباں آمد
ہند در فصلِ خزاں نیز بہارے دارد   گونہ گوں سبزہ گلی بندِ خیاباں آمد
دَے و بہمن کہ در اقلیمِ دگر یخ بندد   اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
نیشکر بسکہ صف آراست، کمربود بہ نسیم   گفت جانیست دگر سرزدہ[۳] نتواں آمد
نخلِ نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ   گوی چوگاں بکف آورد و بمیداں آمد
تا برد داغِ غمِ ہجرِ شقائق ز دلش   گلِ صد برگ بدلجوئیِ دہقاں آمد
گر نہ گرمیِ ہنگامہ تماشا دارد   از چہ نرگس پےِ نظارہ بہ بستاں آمد

صفت موسمِ بہار

تشبیب قصیدۂ مدحیہ نرندر سنگھ سرگباشی رئیس پٹیالہ

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستاں گیرد
دہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد
برات بر زرِ گل کردہ اند پنداری
کہ غنچہ را سپہِ سبزہ در میاں گیرد
کمر بگردِ گل از بہرِ پاس حلقہ زدہ است
کہ ژالہ را ز ہوا سبزہ بر سناں گیرد
ستادہ سروِ بدار، اہتمام بر درِ باغ
کہ تا بہار دگر راہ بر خزاں گیرد
ز ژالہ غنچہ بہ سرمست شاہدے ماند
کہ بعدِ بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد
چمن ز عکسِ شفق ساتکینِ مُل گردد
سمن ز جوشِ طرب رنگِ ارغواں گیرد
زنند گر ہمہ آتش بہ خار، گل بالد
کشند گر ہمہ پیکر ز سنگ جاں گیرد
ز انبساطِ ہوا بعد ازیں عجب دارم
کہ مرغِ قبلہ نما جا در آشیاں گیرد

ز گل نگہ نتواں داشت دل، بحیلۂ عشق
اگر ز ما نتواند ز دل ستاں گیرد
جہاں بکنجِ چمن یافت ذوقِ طاعتِ حق
کہ شیخِ شہر چو ما ترکِ خان و ماں گیرد
حریصِ جلوہ، نگر در ہجومِ لالہ و گل
چو آں گدائے کہ دنبالِ کارواں گیرد
چنیں کہ شاخ ہمی سینہ بر زمیں مالد
چرا کسے ثمر از دستِ باغباں گیرد

کیفیتِ صبح

تشبیب قصیدۂ منقبت حضرتِ امیرؑ

صبحے کہ در ہوائے پرستاریِ وثن[1]
جنبد کلیدِ بتکدہ در دستِ برہمن
در رُفت و روبِ دیر، دمِ گرمِ راہباں[2]
آرد بروں گداختۂ شمع از لگن
خیزند دستہ دستہ مغاں نشستہ روے
در آرزوی چیدنِ برسم[3] ز نارون
از شورِ دیریاں بگمانِ خروشِ صور
اموات را ز رقص بہ تن بردرد[4] کفن
رخشد ستارہ از رُخِ ناشستۂ صنم
بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ شمن[5]
بر رُوے خاک جلوہ کند سایہ در نظر
بر بُوے دوست حلقہ زند مرغ در چمن
خواہد چراغِ کشتہ چو شخصِ بُریدہ سر
خیزد گلِ شگفتہ چو رنجورِ خستہ تن
بر جامِ مُل ز دیدۂ شبنم چکد نگاہ
بر رُوی گل ز طرۂ سنبل دَوَد شکن
غوغائے روز پردہ کشاید ز خوب و زشت
آوائے کوس خواب رُباید ز مرد و زن

فخر و خود ستائی با شکوۂ بخت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جنابِ امیرؑ کی منقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق ناآشنا ہیں؛ گر باوجود اس کے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس لیے نہ اس کو اس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جا سکتا ہے، اور نہ اوّل سے آخر تک نقل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمونِ مندرجۂ عنوان انتخاب کر کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی، مشکل مقامات کی شرح بھی کی جائے گی۔

بندِ اوّل

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام   شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اس نور ظہود کے وقت آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے، اس کو بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اس کی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں، یعنی کواکب یا ملائک کو اس گردندہ ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینت خلوتخانۂ روحانیاں کانجا ز دور   زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

اینت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے، جہاں میں نے دور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش   لولیے را مہد و عشرتگہ دو مہماں دیدہ ام
ہرگز اے ناداں! بہ رسوائی نہ بندی دل کہ من   ماہ را در ثور و کیواں را بمیزاں دیدہ ام

ان دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے۔ منجموں نے دورِ فلک کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن میں سے ہر ایک حصّے کو برج

کہتے ہیں اور ان کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوڑا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ ان میں سے ہر ایک بُرج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال۔ مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں، اور برعکس اس کے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں۔ اسی طرح ہر بُرج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے۔

ثور اور میزان جن کا دوسرے شعر میں نام آیا ہے، یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں۔ اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اس کے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں دیکھا اور کیوان یعنی زحل کو اس کے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا، اور چوں کہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں، اس لیے اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرت گاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے۔ پھر دوسرے شعر میں دفع دخلِ مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی بُرے معنی پر محمول نہ کرنا چاہیے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے۔

رفتہ ام زاں پس بسیرِ باغ و مرغاں را بباغ   سر برسمِ خواب زیرِ بال پنہاں دیدہ ام

برسمِ خواب یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیرِ بال پنہاں یعنی بازو تلے سر گھسائے ہوئے۔

کلکِ موجِ نکہتِ گل دم زگردش نا زدہ   نامۂ فیضِ سحر نونوشتہ عنواں دیدہ ام

موجِ نکہتِ گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیضِ سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرایا ہے۔ کہتا ہے کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیضِ سحر کا مکتوب جب کہ اُس کا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا، دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیضِ سحر ابھی عام نہ ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔

شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ   طرۂ سنبل ببالیں پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں بادِ سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جس کے ملائم جھونکوں سے گویا

سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیمِ صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالینِ راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

باد سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید　　غنچہ را در رختِ خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا رساں رساں چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جس کی وجہ سے میں نے غنچہ کو رختِ خواب میں آلودہ داماں دیکھا، یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا، مگر چوں کہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اس لیے وہ گویا اپنے رختِ خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبحِ اول گو بروے کس نیاورد از حیا　　صبحِ ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب ان تمام عجائبات کی جو آخرِ شب اُس کو نظر آئے ان کی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبحِ اول (یعنی صبحِ کاذب جو گویا شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا سے اصل بھید منہ پر نہیں لاتی مگر صبحِ ثانی یعنی صبحِ صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے، جن کو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لیے صبحِ صادق ان پر خندہ زن تھی۔ اس کے بعد بند کو اس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے:

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند　　تا بجرم گوش تنہد خلق، خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھ کو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اس لیے کہ کوئی میری بات نہ سمجھنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں، مجھ کو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

از بندِ سوم

روشناسِ چرخ در جمع اسیرانش منم　　نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اس کا روشناس اور پہچاننے والا صرف میں ہوں۔ گویا میں اُس زندان کے روزنِ دیوار کی، جس میں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں، آنکھ کا نور ہوں۔

ثابت و سیارِ گردوں را ز رصد بستم ز علم　　رشتۂ تسبیحِ گوہر ہاے غلطانش منم

چوں کہ رصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں، اس لیے کہتا ہے کہ

میں نے جو آسمان کے ثوابت و سیارات کی رَصَد باندھی ہے، تو گویا میں اس کے گوہر ہائے غلطاں (یعنی کواکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جس کے سبب سے تمام ستارے مثل دانہائے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں۔

نے ز دانش کامیاب و نے بہ سختی تنگدل   شرمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم

اہلِ نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا اضافہ کرنے والا ہے، اور کیواں یعنی زحل سختی اور مصیبت کا بھیجنے والا ہے۔ کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی و مصیبت سے گھبرانے والا ہوں۔ تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوششیں میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں اور اس لیے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں۔

در لئیمی شہرۂ دہر از تہی دستیست چرخ   رفتہ مسکیں راز یاد و گنجِ پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے، یہ اس کی تہی دستی کا نتیجہ ہے، کیوں کہ اس کے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں، وجہ یہ کہ اس کا گنجینۂ پنہاں میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھ کو بھول گیا ہے۔ مسکین سے مرادِ خود آسمان ہے، جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔

در غریبی خویش را از غصہ در دل می خلم   خوردہ ام از شستِ غم تیرے کہ پیکانش منم

یعنی عالمِ غربت میں بسبب غم کے مَیں خود اپنے دل میں چبھتا ہوں۔ گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اُس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباشِ پاسِ وضع   خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

دورباش ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب امراء و سلاطین کی سواری کے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اس کو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاسِ وضع مجھ کو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا۔ پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اس کا دربان میں ہی ہوں۔

پایۂ من جز بہ چشمِ من نیاید در نظر   از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بندِ چہارم

چوں بغیر از غم کاں مفتست ہیچم مایہ نیست   نبودم بیم زیاں گر چرخِ کج بازد بمن

بر منش دستے تواند بود، زاں بالاترم دل بنازم شیرِ گردوں پنجہ گر بازد بمن

پہلے مصرع کی تقدیرِ عبارت یہ ہے: "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود"۔ شیرِ گردوں سے مراد خود گردوں یا بُرجِ اسد یا مریخ۔ پنجہ بازیدن، دست دراز کردن و حملہ نمودن۔ دل باختن، بدحواس شدن۔

ہر کرا گردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر نوبتِ شاہی دہد وانگاہ بنوازد بمن

بنوازد بمن، یعنی اس کو میرے ذریعہ سے معزز کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس کی تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کارِ ہر کس ست دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندازد بمن
ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود، بیم نیست خود بہ شاہاں مایہ بخشم، گر بپردازد بمن
آنکہ چوں در ملکِ ہستی سکۂ شاہی زند سکۂ شاہی بطغرائے یداللّٰہی زند

قولہ "پادشہ را مایہ نبود" اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطینِ عہد اس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اُس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور پادشاہ کے لقب سے ملقب تھے، وہ گردشِ روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہ "گر بپردازد بمن" بپردازد کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی "آنکہ چوں در ملکِ ہستی الخ" مراد اس سے حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰؑ ہیں جن کی منقبت میں مرزا نے یہ بند لکھا ہے۔

قطعات

توجیہِ توارد خود با کلامِ سلف

ہزار معنیِ سرجوش، خاصِ نطقِ من ست کز اہلِ ذوق دل و گوش از عَمل بُردست
ز رفتگان بیکے گر توارُدم رُو داد مداں کہ خوبیِ آرایشِ غزل بُردست
مراست ننگ، ولے فخرِ اوست کان سخن بسعیِ فکرِ رسا، جا بداں محل بُردست
مبر گمانِ توارد، یقین شناس کہ دُزد
متاعِ من، ز نہاں خانۂ ازل بُردست

رندانہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

خطاب بہ یکے منافقانِ تونگر

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم — مخلصِ صادق الولاے تو، من
گر ترا شیوہ شاہدی بودے — کردمے جان و دل فداے تو، من
ور ترا پیشہ شاعری بودے — سودمے چشم و سر بہ پاے تو، من
ور ترا پایہ خسروی بودے — گفتمے گوہرِ ثناے تو، من
چوں ازیں ہا نۂ، مرا چہ ضرور — کہ شوم ہرزہ مبتلاے تو، من
راست گویم، بہانہ چند آرم — ناصحِ مشفقم، براے تو، من
بسکہ بر مال و جاہ مغروری — نیستم خوش ازیں اداے تو، من
چکنی؟ کایں فسادِ سیم و زرست — واے من! اگر بوم بجاے تو، من
بتو ہرگز ندادمے زر و سیم — خواجہ! اگر بودمے خداے تو، من

خطاب بہ یکے از نواصب

دیدی آں بدگہر و مہر و ولایش بہ یزید — کہ بہ خشم آید اگر زشت و پلیدش گویند
زانکہ او خود بسرِ ابنِ علی تیغ نہ راند — خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبیر بداں می ارزد — کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند — نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

خطاب بہ یکے از مخالفانِ خود

کردہ جہدے کہ در ویرانی کاشانہ ام — چرخ در آرایشِ ہنگامۂ عالم نہ کرد
گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا، بر خود مپیچ — زانکہ حرفے زانچہ گفتم، خاطرم خرم نہ کرد

بیتے از اُستاد دیدم ذوقہا بخشید لیک — ہیچ در تسکیں نیفزود و ز وحشت کم نہ کرد
"ہمچو تو ناقابلے در صلبِ آدم دیدہ بود — زاں سبب ابلیسِ ملعوں سجدہ بر آدم نہ کرد"
حاش للہ بودنت در صلبِ آدم تہمت ست — پیشِ ہر کس گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نہ کرد

شوخی

لبہ نیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت — نمیرسد ز تو خاروخسے ز ہیچ سبیل

چو لازم ست کہ پروردگار تا دمِ مرگ   بود بہ رزقِ ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری زر از سیاہ و سفید   چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل
فتادہ در سرِ این رشتہ عقدۂ، ورنہ   نہ ردیٔ تو و نے رازق العباد بخیل
ز چند سال برگِ تو و تباہیِ رزق   شدست حکم، خود از پیشگاہِ ربِ جلیل
فرشتہ کہ وکیل ست بر خزائنِ رزق   نکردہ ہیچ توقف بہ رزق در تعطیل
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر معزول باد   روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفہ یکتم از قولِ شاعرے تضمین   کہ در لطیفہ مر او را کسے نبودہ عدیل
„اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز   ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل“

شوخی

بہ آدم زن، بہ شیطاں طوقِ لعنت   سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم   گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں۔ مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جس کا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مُراد کا جو عنفوانِ شباب میں گزر گیا تھا، ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے، جو اس کے کلیات میں موجود ہے اور چوں کہ نظیری کو اس کے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اس کی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے ان کے جلدو میں پائے ہیں اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اس کا مرثیہ کمال صدقِ دل سے لکھا ہے۔

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا، جو عین نشوونما کے زمانے میں فوت ہو گیا تھا، مرثیہ اُسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے، جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چوں کہ دونوں ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیے میں لکھے گئے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور ہر ایک بند آٹھ بیت کا ہے اس لیے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل میں دیتے ہیں، تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے، دونوں میں بآسانی موازنہ کر سکے مگر افسوس کہ کلیاتِ نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہم کو دستیاب نہیں ہوا لہٰذا جیسا کچھ لکھا

ہوا پایا، نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جن کی نسبت ظنِ غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

بند اوّل

غالب	نظیری
اے دل! بچشمِ زخمِ حوادث نگار شو	لب خوش نگشتہ، خندہ رو چنگ میزند
اے چشم! از تراوشِ دل اشکبار شو	در بزمِ مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں! بدیدہ دردِ گدازِ جگر فرست	ہرگز زمانہ، جامۂ ماتم بروں نہ کرد
اے دم! بسینہ دودِ چراغِ مزار شو	نا رفتہ شب، بدامنِ شب چنگ میزند
اے لب! بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ	وقتِ گذشتہ را بہ تاسف ز پے مرو
اے سر! بغصہ خاکِ سرِ رہگذار شو	کاینجا نشاط گام بفرسنگ میزند
اے خاک! چرخ گر نتواں زد، زجا درآے	ایں دہر روز کور، کش ایام خصم باد
اے چرخ! خاک گر نتواں شد، غبار شو	دستِ طمع بہ گیسوے شبرنگ میزند
اے نوبہار! چوں تنِ بسمل، بخوں بغلط	دستِ اجل بہ تیغِ سیاست بریدہ باد
اے روزگار! چوں شبِ بے ماہ، تار شو	از خاک مہر بر دہنِ تنگ میزند
اے ماہتاب! روی بہ سیلی کبود کن	آرایشِ جنازہ و دستار میکند
اے آفتاب! داغِ دلِ روزگار شو	گوئی کہ گل بر افسر و اورنگ میزند
اے فتنہ! بادِ صبح وزید، اینقدر مخسپ	ایں چرخ شوخ دیدہ عجب بے بصارت ست
اے رستخیز! وقت رسید، آشکار شو	بر جامِ عشرت کہ، بہ ہیں سنگ میزند
آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت	فرزندِ شاہِ اکبرِ والا نژاد مُرد
تنہا ز سر مگو کہ، ز دیوار و در گذشت	شیون برآورید کہ سلطان مراد مُرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پُرشوکت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعتِ شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے، مگر واقعہ کی عظمت جس قدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی، اس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے، بخلاف نظیری کے کہ اس کا بیان اگرچہ رُوکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے، مگر متانت و اعتدال کا سررشتہ اس نے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب	نظیری
بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار	آفاق پُر دریغ و جہاں پُر ندامت ست
با پادشاہِ عہد چہا کرد روزگار	ایں روزِ مرگ نیست کہ روزِ قیامت ست
شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را	خلقے پُر اضطراب، چہ جاے تمکن ست
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار	دہرے پُر انقلاب، چہ جاے اقامت ست
شاخے کہ بود موسمِ آتش کہ بردہ	ایں ماتم کسے ست کہ از گریہ تا بہ حشر
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار	بر جیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست
مرگ اینچنیں زُرخ و تنِ نازک ندیدہ بود	خوں میکند بجلوہ دلِ خلق، گوئیا
کامِ اجل بہ ہدیہ روا کرد روزگار	نخلِ جنازہ رستہ ازاں نخلِ قامت ست
شہزادہ خُرد سال و بود روزگار پیر	ہرکس چنیں جمال در آرد بحشرگاہ
شوخی بشاہزادہ چہا کرد روزگار	رضواں گرش بہشت دہد غرامت ست
فرزندِ پادشہ نشناسد معانقہ	دل از نویدِ صحتِ او بزمِ شور بود
آغوشِ گور بہر چہ وا کرد روزگار	اکنوں سرائے ماتم و کوی ملامت ست
اے آں کساں کہ خاکِ رہِ شہریار را	یاراں! عجب شکارے کہ از دست دادہ ایم
توجیہ آبروے شما کرد روزگار	بر سر زنید دست کہ وقتِ ندامت ست
ہرچند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مُرد	شہبازِ ما پریدہ، رہِ آسماں گرفت
آتش بخود زنید کہ فرخندہ شاہ مُرد	مرغے نرفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونوں بند سادگی اور مرثیت میں تقریبًا برابر سرابر ہیں، البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر جس رتبہ کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب	نظیری
اے قوم! خویش را بشکیب امتحاں کنید	اے بزمِ تیرہ! سرخ چوں ارغواں کجاست
ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید	وے بزمِ درہمی! شہ گیتی ستاں کجاست
طفل ست شاہزادہ و در رہ خطر بسے ست	شوقِ سجود و حرمتِ تعظیم کم ترست
منعش ز عزمِ رہروی آں جہاں کنید	آں نازِ صدر و سرکشیِ آستاں کجاست

از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد، آں دہید
از حیلہ آنچہ رائے شما باشد، آں کنید
ہر حرفِ دلنشیں کہ بگوید و نشنود
آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید
در خود ز رفتنش نتوانید باز داشت
بیخود شوید، جامہ درید و فغاں کنید
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید
تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید
زنہار پیشِ شاہ مگوید و بے خبر
تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید
اے اہلِ شہر! مدفنِ ایں دودماں کجاست؟
خاکم بفرق، خوابگہِ خسرواں کجاست؟

امروز غم بہ مسندِ شاہی نشستہ است
پہلو نشینِ خسروِ ہندوستاں کجاست
آں حکمہا کہ بود ازو آب کار کو؟
واں کارہا کہ آمد ازو بوی جاں کجاست
دلہا پُر از غم ست، عزیزاں اچہ واقع ست
یک دل شگفتہ نیست، خوشی در جہاں کجاست
ہر جا بسوگِ مرگ گروہے نشستہ اند
زیں غم کہ عام گشت ندانم اماں کجاست
برگِ شگوفہ ریخت، ثمر از کجا خورم
بشکست شاخ و برگ، مرا آشیاں کجاست
کس را سرود در خورِ ایں تعزیت نہ بود
پیدا کنید کا قولِ ایں داستاں کجاست
خلقے بشیون اند و نگویند حال چیست
صبرِ سخن شنیدن و تابِ بیاں کجاست
آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعثِ الم مرد و زن شدہ

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیے ہیں۔ نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو، مگر مرزا کے بین نہایت دلخراش ہیں۔ متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں، اس کو جانے نہ دو اور وہ جو کچھ مانگے اس کو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو، وہ کرو اور اگر سیدھی طرح کہنا نہ مانے، تو اس کو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر تابوت مرقد میں لے جاؤ، یہ تمام پیرایے بیان کے نہایت موثر اور دلخراش ہیں، اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب	نظیری
زاں سبز خط کہ بر رُخِ او نادمیدہ ماند	غم خاست، در پیالہ مے از ساغر افگنید
گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند	شد بزم تیرہ، پردہ ازاں رُخ برافگنید
بستانیاں بماتمِ شہزادہ بیخود اند	شمعے کہ دہر روشن ازو بود، مردہ است
زیں رُو بود کہ پیرہنِ گل دریدہ ماند	پروانہ را بریدہ بہ خاکستر افگنید
خوں گشتہ بود دل و جگرِ دوستاں فتاد	در خانہ اش ز حلقۂ ماتم خرام نیست
آں بادہ ہائے ناب کزو ناکشیدہ ماند	ایں حلقہ را ز صحنِ سرا بر در افگنید
در مدحِ شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر	ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشوہ ریختہ
دردا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند	چینید و ہم بر آں قدِ جاں پرور افگنید
در وادیِ عدم نتواں رفت با حشم	بالیں ز تابِ کاکلش آشفتگی کشید
ماند آنچہ بود و صاحبِ عالم جریدہ ماند	کوتہ کنید عربدہ در کشور افگنید
زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش ز پا فگند	رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود
خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند	بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشینِ خلق	پوشیدہ چند جامۂ نیلی ز جورِ چرخ
بُوے ازاں شگفتہ گلِ نورسیدہ ماند	بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
آں سروِ سایہ دار کہ بارش نبود، کو؟	خیزید، تا بآں سرِ تابوت دم زنیم
واں نوگلِ شگفتہ کہ خارش نبود، کو؟	عرضے کنیم و کارِ وداعش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت لے گیا ہے، جیسا کہ اصحابِ ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بندِ پنجم

غالب	نظیری
دستے ست اے سپہر! ترا در ستمگری	رفتی و کارہا ہمہ درہم گذاشتی
بارے برم ز جورِ تو پیشِ کہ داوری	آشفتگی بہ مردمِ عالم گذاشتی
نیرنگ سازِ چرخ کہ بیداد خوے اُوست	جانہائے غم رسیدہ و دلہائے بیقرار
باگل کند سمومی و باشاخ صرصری	در پیچ و تابِ طرۂ پرخم گذاشتی

داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری
حیف ست مردنش کہ در ایام کودکی
بود اوستادِ قاعدۂ بندہ پروری
شہ در دہ و دو سالگیش کردہ کدخدا
با فرِ خسروانی و فرتابِ قیصری
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد
امضا پذیر ناشدہ توقیعِ شوہری

جز نو عروسِ صاحبِ عالم نیافتند
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بہ دختری
زیبائی و جوانیِ فرخندہ شاہ حیف!
آں نونہالِ سرو قدِ کجکلاہ، حیف!

از تو غبار بر دلِ بیگانہ نہ بود
بہر چہ بر دلِ پدر ایں غم گذاشتی
رخش و شبت بہ رسمِ جنیبت ستادہ بود
در زینِ خویش اشہب و ادہم گذاشتی
شمعِ مزار و خشتِ لحد ساختی قبول
رخسارِ تخت و طرۂ پرچم گذاشتی
ہمت ترا بہ ملک نیاورد سر فرو
عالم بہر کہ خواست مسلم گذاشتی

حرمت نگاہداشتی و جائے خویش را
بہر برادرانِ مقدم، گذاشتی
خون ست بے تو گر ہمہ دل چوں دلِ من ست
ہر دل کہ بے تو خوں نشود، سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں، مگر متانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلّہ غالب معلوم ہوتا ہے۔

بند ششم

غالب

اے رہ نوردِ عالمِ بالا! چگونہ؟
ما بے تو در جحیم، تو بے ما چگونہ؟
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما
اے خفتہ در نشیمنِ عنقا! چگونہ؟
زاں پس کہ با تو آب و ہوائے جہاں نساخت
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونہ؟
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی
با حوریانِ آئینہ سیما، چگونہ؟
ما بے خوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم
از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونہ؟

نظیری

اے شاہِ مصر! دور ز کنعاں چگونہ؟
اے یوسف! از جدائیِ اخواں چگونہ؟
ہرگاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ می کنی
با حسنِ شوخ در تہِ زنداں چگونہ؟
اسکندر از غمِ تو بظلمت نشستہ است
در زیرِ گل تو چشمۂ حیواں چگونہ؟
اے پارۂ ز جان و جگر گوشۂ پدر!
گشتہ جدا ز دیدہ و داماں چگونہ؟
ما بارے از فراقِ تو در خون دیدہ ایم
تو درمیانِ روضۂ رضواں چگونہ؟

بے مطرب و ندیم و غلامانِ خُرد سال
بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ خیلِ ترا بر قرار داشت

اینجا عزیز بودۂ، آنجا چگونۂ
اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
پروانۂ چراغِ مزارِ تو عالمے

آوازِ نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند
اے بختِ خوش بخوابِ پریشاں چگونۂ
اینجات کارِ دفتر و دیواں حوالہ بود

آنجا بگو ز پرسشِ دیواں چگونۂ
قلزم سبک ثبات ترا آنجا ز شبنم ست
در بحرِ کل تو قطرۂ باراں چگونۂ
بشنو کہ بانگ بہرِ تو بر حشر می زنند
تا بنگریم در صفِ دوراں چگونۂ
چوں کارِ رفتگانِ دگر نیست کارِ تو
محشر شتاب میکند از انتظارِ تو

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اس کے تمام ترکیب بند کی جان ہے۔ اگرچہ مرزا کے ہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں، مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھ کر پایا جاتا ہے۔

بند ہفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس
در نوحہ، شاعری مکنید از من التماس
در پردہ سنجی از دمِ خویشم رسد گزند
وز بے دمی ز سایۂ خویشم بود ہراس
من میہمان و چرخِ سیہ کاسہ میزبان
دُردی خورِ بلا کم و تلخابہ نوشِ یاس

باقی نماندہ اشک، چہ گریم بہ ہای ہای
از کار رفتہ دست، چہ بر تن درم لباس
سر حلقۂ پلاس نشینانِ ماتمم
اندوہِ ہمدمانِ شہ از خود کنم قیاس
چوں بود بزمِ ماتمِ شہزادہ بے خروش

نظیری

فردا کلاہِ بادشہی بر سرِ تو باد
رسم العمل بروزِ جزا دفترِ تو باد
فردا کہ روزِ حشر برانگیزی از زمیں
دوش و کنارِ حور و پریِ محشرِ تو باد
روزے کہ کارہا ہمہ موقوفِ حق شود
جبریل کارساز و خدا یاورِ تو باد

وقتِ سوال گوش و لبِ منکر و نکیر
پُر از قبولِ نکتۂ جاں پرورِ تو باد
آں علّہ کہ آدم ازو ذلّ و قید یافت
گر رحمتِ دو کون بود، در برِ تو باد
مجموعۂ عمل چو بہ محشر در آوری

من دم نزدم ز تلخ نوائی بریں پلاس
از نوحہ عرضِ لطفِ سخن میتواں گرفت
غالبِ سخن سرای و شہنشہِ سخن شناس
یارب جہاں ز فیضِ تو بابرگ و ساز باد
عمرِ ابوظفر شہِ غازی دراز باد

کارِ تو راست ہمچو خطِ مسطرِ تو باد
مغز از بخورِ روے مزارت معطرست
بوے بہشت ہم نفسِ مجمرِ تو باد
آدم بہاے تو نشناسد دریں جہاں
تسبیحِ قدس در دلِ کانِ گوہرِ تو باد
نخلِ ریاضِ ملک کہ بابِ عزیزِ تست
سرسبز از دعاے ثناگسترِ تو باد
کارش بہ حُسنِ شاہدِ فرخندگی بود
ہرچند بر تو مرگ، بر و زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہم کو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیاتِ نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اس ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے ان کی شرح کی جاتی جس سے ناظرین کو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا۔ لیکن بھلا

کہتا ہے کہ رزستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسروِ گل کا شراب خانہ ہے کیوں کہ اس میں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔

رز و غمِ تردامنی مخور کہ جہاں را | موجِ گل از ہر کرانہ تا کمر آمد
فتوی مے داد ابر و باد ولیکن | شیشہ نہاں بہ کہ ژالہ بدگہر آمد

از تشبیب قصیدۂ مدحیہ ملکۂ معظمہ

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا

در روزگار ما نتواند شمار یافت | خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکار تیز گرد فلک در میاں ببیں | حق داد داد حق کہ بمرکز قرار یافت
دریاے آسماں بزمیں باز گرداند | ہر کس ہر آنچہ جُست بہر روزگار یافت
آمد اگر لغزش ز بالا بلا فرود | برگوے خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
چوں حسن با ملک شہ بینی ایلک کہ ماہ | پاداشِ جانگدازیِ شبہاے تار یافت
چوں رنگِ روے گل نگری شاد شو کہ گل | اجرِ جگر خراشیِ پیکانِ خار یافت

درخاک و باد و آتش و آب آشتی فزود　　　این پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جزبہ داد گرایش نمی کند　　　در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
ہر کس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت　　　ہر شے بحسنِ جوہرِ خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نبشت　　　ہم بندۂ سرائے خودش بندہ وار یافت
ور بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید　　　توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش از سر گرفت　　　لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد　　　ناہید ذوقِ ورزشِ مضراب و تار یافت
نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد　　　اندیشہ گنجہائے نہاں آشکار یافت

ارادہ ہے کہ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی، تو بشرطِ زندگی اس نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اب ہم کو مرزا کی کلیاتِ نظمِ فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضائے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں، مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی۔ ان کے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں، جن میں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے۔ اس مثنوی میں جس کا نام مرزا نے ابرِ گہربار رکھا تھا، ان کا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا، مگر چوں کہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے، اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی۔ صرف دیباچے کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہاتِ روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی اُن کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے، جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپاسے کزو نامہ نامی شود   سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کز شوریدگانِ الست   دہندش بہ بانگِ قلم دل ز دست
سپاسے بہ پوزش در آمیختہ   ز دل جستہ و با دل آویختہ
سپاسے دوئی سوزِ کثرت ربائے   سپاسے دل افروزِ بینش فزائے

خدا را سزد کز دروں پروری   بدیں شیوہ بخشد شناساوری
خدائے کزاں گونہ روزی دہد   کہ ہم روزی و ہم دوروزی دہد

* * * *

رضا جوے ہر دل کہ درویش ہست   ہواخواہِ ہر دل کہ گردیش ہست
ز نجد ز انبوہِ خواہندگان   نباید ستوہ از نیابندگان
خرد جنسِ ہستی فروشندگان   دہد مزدِ بیہودہ کوشندگان
نباید دل، امّا ز دل دادگان   کشد ناز، لیکن ز افتادگان
زبانے کہ بر دل وزد در نہفت   زباں را بہ پیدا در آرد بگفت
نگہ را کہ بیروں نہ باشد ز چشم   دہد بالِ پیدائیِ مہر و خشم
دل و دست باہم گرہ دوختہ   دریں کیسہ کردار اندوختہ

یعنی در کیسہ کہ از ہم دوختنِ دل و دست بہم رسیدہ، کردارِ مردم اندوختہ است۔

روان و خرد باہم آمیختہ   ازیں پردہ گفتار انگیختہ
نہ زیں سو گہرہا شمردن تواں   نہ راہ اندریں پردہ بیختن تواں
بہ نیروے نہ چرخ برہم زدن   نشاید ز دانستِ او دم زدن

یعنی بقوتے کہ ازاں نہ چرخ را برہم میتواں زد، از معرفتِ الٰہی دم نہ می تواں زد۔

گروہے بہ بندِ گہر بافتن   فرو بستہ دل در زمیں کافتن
یکے را دم تیشہ بر کان نخورد   یکے رہ بہ نایاب گوہر نبرد
خرد کز جہانے ست پیشش خبر   نباشد ز عنوانِ خویشش خبر
نہ بیند جز ایں ہیچ بینندۂ   کہ ما را بود آفرینندۂ
نگارندۂ پیکرِ آب و گل   شمارندۂ گوہرِ جان و دل
بگردش در آرندۂ نہ سپہر   بہ گردوں برآرندۂ ماہ و مہر

روان را بدانست سرمایہ ساز   زبان را بگفتار پیرایہ ساز
بہ شاہی نشانندۂ خسرواں   ز رہزن رہانندۂ رہرواں
بدانش بہ اندیشِ فرزانگاں   بہ مستی نگہدارِ دیوانگاں
جگر را ز خونابہ آشام دِہ   نفس را بہ بیتابی آرام دِہ
شناسندگاں را بخود رہنماے   ہراسندگاں را غم از دل رُباے
نفسہا بہ سوداے او نالہ خیز   جگرہا بہ صحراے او ریز ریز
رگِ ابر را اشکباری از وست   دمِ برق را بیقراری از وست
زبانہاے خاموش گویاے او   نہانہاے اندیشہ پیداے او
خرد را کہ جوید شناسائیش   نگہ خیرہ در برقِ پیدائیش
دوئی بے کفن مردۂ در رہش   خودی دادگر شحنۂ درگہش

◆ ◆ ◆ ◆

نہے ہستیِ محض و عینِ وجود   کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
ز شاخابہ گز قلزمے سر دہد   بہر تشنہ آشامِ دیگر دہد
بیک بادہ بخشد ز بیمانۂ   بہر فرقہ رقصے جداگانۂ
جہانِ ز طوفان بغرقاب در   ہنوزش ہماں چین بگرداب در
گروہے ز مستی بہ غوغا دردل   ہنوزش ہماں مے بہ مینا دردل
اسیرش ز بندے کہ بر پاے اوست   شناسد کہ بر تختِ چیں جاے اوست
شہیدش بخونش از طرب بہرہ مند   بجز چشم زخمش نباشد گزند

◆ ◆ ◆ ◆

بہر لب کہ جوئی نواے از وست   بہر سر کہ بینی ہواے از وست
اگر دیوسار ست بیہوش و دنگ   کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ

بہ بت سجدہ زاں رُو روا داشتہ   کہ بت را خداوند پنداشتہ
وگر خیرہ چشمے ست نیر پرست   بہ دُردِ مے از جامِ اندیشہ مست
بمہرش ازاں راہ جنبیدہ مہر   کزیں روزنش دوست بنمودہ چہر
ز نّاری درونانِ اہریمنی   گروہے بود کز خردِ دشمنی
ز بس رادِ ناآشنائی دہند   بہ آتش نشانِ خدائی دہند

بہ تن ہا بر آذر گرایش کناں — بدلہا خدارا نیایش کناں
گروہے سراسیمہ در دشت و کوے — خداوند جوے و خداوند گوے
ز رسمے کہ خود را بر آں بستہ اند — بیزداں پرستی میاں بستہ اند
ز مہرے کہ بیخواست در دل بود — پرستند حق گر بہ باطل بود
نظرگاہِ جمعے پریشاں یکیست — پرستندہ انبوہ و یزداں یکے ست
کدامی کشش کاں نہ زاں سو کشیست — بد و نیک را جز بسوے وے نیست
جہاں چیست؟ آئینۂ آگہی — فضائے نظرگاہِ وجہ الٰہی
بہر سو کہ رو آوری سوے اوست — خود آں رو کہ آوردۂ روے اوست

از مناجات

بروزے کہ مردم شوند انجمن — شود تازہ پیوندِ جانہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں — بہ سرمایۂ خویش نازندگاں
گہرہاے شہوار پیش آورند — فروہیدہ کردار پیش آورند
ز نورِ یکہ ریزند و خرمن کنند — جہاں را بخود چشم روشن کنند
بہ ہنگامہ با ایں جگر گوشگاں[۳] — درآیند مشتے جگر توشگاں[۴]

ز حسرت بدل بردہ دنداں فرو — ز خجلت سر اندر گریباں فرو
دراں حلقہ من باشم و سینۂ — ز غم ہاے ایام گنجینۂ
در آب و در آتش بسر بردۂ — ز دشواریِ زیستن مُردۂ
تن از سایۂ خود بہ بیم اندروں — دل از غم بہ پہلو دو نیم اندروں
ز ناسازی و ناتوانی بہم — دم اندر کشاکش ز پیوندِ دم
ز بس تیرگیہاے روزِ سیاہ — نگہ خوردہ آسیبِ دوش از نگاہ
ببخشاے بر ناکسی ہاے، من — تہیدست و درماندہ ام وائے من!
بدوشِ ترازو منہ بارِ من — نسنجیدہ بگزار کردارِ من
بکردار سنجی میفزاے رنج — گراں باریِ دردِ عمرم بسنج
کہ من با خود از ہر چہ سنجد خیال — ندارم بغیر از نشانِ جلال[۱]
اگر دیگراں را بود گفت و کرد — مرا بادۂ عمر رنج ست و درد
چہ پرسی چو آں رنج و درد از تو بود — غمے تازہ در ہر نفس از تو بود

فرو ہل کہ حسرت خمیرِ من ست   دمِ سردِ من، زمہریرِ من ست
مبادا بہ گیتی چو من ہیچ کس   جحیمی دل، زمہریری نفس
بپرسش مرا درہم افسردہ گیر   پرِ کاہ را صرصرے بُردہ گیر
پس آنگہ بدوزخ فرستادہ دان   در آتش خس از باد افتادہ دان

پُرسش سے مراد باز پرسِ قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرِ کاہ کو بادِ صرصر اڑا لے گئی اور یہ فرض کر لے کہ میں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا دہکتی آگ میں گر چکا۔

دگر ہمچنین ست فرجام کار   کری باید از کردہ راندن شمار

یعنی اگر انجامِ کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے، تو

مرا نیز یارائے گفتار دِہ   چو گویم بران گفتہ زنہار دِہ
درین خستگی پوزش از من مجوی   بود بندۂ خستہ گستاخ گوی

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے، اس پر مجھ سے عذر مت چاہنا کیوں کہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بے باک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد، نہفتن چہ سود   چو ناگفتہ دانی، نگفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم، اما ز تست   بتست ار چہ گفتارم، اما ز تست
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم   پرستارِ خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہریمنی   نبردم ز کس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست   بہنگامہ پروازِ مورم ازوست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی ہے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگوزم ازوست" اور "پروازِ مورم ازوست" منتہائے بلاغت ہے۔ نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور امنگ پیدا ہو جاتی ہے، اُس کو پروازِ مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اس کی موت کی علامت ہے، اسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخر کار مورثِ ہلاکت ہوتا ہے۔

من اندہگین و مے اندہ ربائے   چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے!

حسابِ مے و رامش و رنگ و بوے   ز جمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند   دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ من گاہ گاہ   بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانہ نہ   نہ دستاں سرائے[2] نہ جانانہ نہ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط   نہ غوغاے رامشگراں[3] بر بساط
بسا روزگاراں بہ دلدادگی   بسا نو بہاراں بہ بے بادگی
بسا روزِ باران و شبہاے ماہ   کہ بودہ است بے مَے بچشمم سیاہ
افق را پُر از ابرِ بہمن مہی   سفالینہ جامِ من از مَے تہی
بہاران و من در غمِ برگ و ساز   درِ خانہ از بے نوائی فراز[4]
جہان از گل و لالہ پُر بوی و رنگ   من و حجرہ و دامنی زیرِ سنگ
دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبود   بہ اندازۂ خواہشِ دل نبود
اگر تافتم رشتہ، گوہر شکست   وگر یافتم بادہ، ساغر شکست
چہ خواہی ز دلقِ مَے آلودِ من   ببیں جسمِ خمیازہ فرسودِ من
بناسازگاری ز ہمسایگاں   بہ سرمایہ جوئی ز بے مایگاں
سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک   لب از خاکبوسِ خساں چاک چاک
بگیتی ز رزم بینوا داشتی   دلم را اسیرِ ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد   بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے   زرش بر گدایاں فرو ریزمے
ز نازک نگاہے کہ نازش کشم   بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

بدیں عمرِ ناخوش کہ من داشتم   ز جاں خار در پیرہن داشتم
چو دل زیں ہوسہا بجوش آیدے   ز دل بانگِ خونم بگوش آیدے
ہنوزم ہماں دل بجوش اندرست   ز دل بانگِ خونم بگوش اندرست
چو آں نامرادی بہ یاد آیدم   بہ فردوس ہم دل نیاسایدم
دلے را کہ حسرت کشیدہ بباغ   در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شرابِ طہور   کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور

دمِ شب رویہائے مستانہ کو   بہنگامۂ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش   چہ گنجائیِ شورشِ نائے و نوش
سیہ مستیِ ابر و باراں کجا   خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ   غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار   چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ، اینش کجا   فریبد بہ سوگند، دینش کجا
بُرد حکم و نبود لبش تلخ گوے   دہد کام و نبود دلش کامجوے
نظربازی و ذوقِ دیدار کو   بہ فردوس روزن بدیوار کو
ز چشمِ آرزومندِ دلالۂ   ز دل تشنۂ ماہ پرکالۂ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل   ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چو پرسش رگے را بکاود ز دل   دو صد جا خونم تراود ز دل
بہر جرم کز مے دفتر رسد   ز من حسرتے در برابر رسد
بغوغائے کاں داوری چوں بود   کہ از جرمِ من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہمچوں منے را بہ بند   تلافی فراخور بود نے گزند
بدیں مویہ در روزِ امید و بیم   بگریم بدانساں کہ عرشِ عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جوے   تو بخشی بداں گریہ ام آبروے
دگر خونِ حسرت ہدر کردہٗ   ز پاداش قطعِ نظر کردہٗ
گزشتم ز حسرت، امیدیم ہست   سپید آبِ روی سپیدیم ہست
کہ البتہ ایں رندِ ناپارسا   کج اندیشہ گبرِ مسلماں نما
پرستارِ فرخندہ منشورِ تست   ہوادارِ فرزانہ وخشورِ تست
بہ بندِ امید استواری فرست   بہ غالب خطِ رستگاری فرست

از نعتِ سید المرسلین

محمدؐ کز آئینۂ روے روست   جز اینش ندانست دانا کاوست
سہے روشن آئینۂ ایزدی!   کہ در روے گنجینہ زنگِ خودی
ز رازِ نہاں پردہ بر زدہ   ز ذاتِ خدا معجزے سر زدہ

تمنائے دیرینۂ کردگار   بُتے ایزد از خویش امیدوار
تن از نور پالودہ سرچشمۂ   دلے ہمچو مہتاب در چشمۂ
بہر جام از تشنہ جرعہ خواہ   بہر گام از معجزے سر براہ
کاوش بدل، دد فرو دامنش   ز دم جستہ پیشی بہ زود آمدن
خرامش بسنگ از قدم نقش بند   برنگے کہ نادیدہ پایش گزند
بدستش کشادِ قلم ہدما   بکلکش سوادِ رقم نارسا
دل امید جائی زیاں دیدگاں   نظر قبلہ گاہِ جہاں دیدگاں
برفتار صحرا گلستاں کنے   بگفتار کافر مسلماں کنے
بدنیا ز دیں روشنائی دہے   بعقبیٰ ز آتش رہائی دہے
بخوے خوش، اندُہ کاہِ ہمہ   بآمرزشِ امیدگاہِ ہمہ
زبس محرمِ پردۂ راز بُود   بنزدیکیِ حق سرافراز بُود
ررزنے کہ بادے سرودے سروش   صدائش بُودے ز اوّل بگوش
خہے قبلۂ آدمی زادگاں!   نظرگاہِ پیشیں فرستادگاں!
کسائی دہِ نسلِ آدم بخویش   روائی دہِ نقدِ عالم بخویش
بلندی دہِ کعبہ بالائے اُو   گرامی کنے سجدہ سیمائے اُو
یمن روشن از پرتوِ روئے اُو   ختن بستۂ چینِ گیسوئے اُو
زبُت بندگی، مردم آزاد کن   جہانے بیک خانہ آباد کن
بمحرابِ مسجد رُخ آرائے دَیر   بہ اندیشِ خویشش دعاگوئے خیر
تو گوئی، زبس دل ز دشمن رباست   کہ سنگِ دلش سنگِ آہن رباست

نثر فارسی

مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے، اس بنا پر کہ وہ وزن سے مبرا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے، تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے، خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ،

مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتدبہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئٹیکل نظم ونسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید اور جلالائے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ ان کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے، مگر وہ بھی اپنی شان اور اپنی آن بان میں بے نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ کیا ہے، تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے، لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے، تو مرزا کی کوئی ادا ان کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں ان کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا، اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی، لیکن چوں کہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی نہیں ہے، اس لیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ ان اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اس کی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے، مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ووافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا، جیسا کہ نظم فارسی میں ان کو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پہ ترجیح دینا،

تاوقتیکہ اس کو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے، ایک بےمعنی بات ہے، لیکن ہم کو اُن لوگوں سے جو وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے، جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں۔

چوں کہ مرزا کی طرزِ انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں، اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم ان کی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کریں گے، جو صاف اور سلیس ہوں۔ اور بااین ہمہ جہاں ضرورت ہوگی، کہیں بین السطور میں، کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائیں گے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے، جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہلِ زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً صد کو سد، شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن، گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ۔ چوں کہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی، اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے، اس لیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے، وہاں الفاظ بدستور قدیم معمولی طریقے کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثرِ فارسی کے نمونے

از مہرِ نیمروز

خطابِ زمیں بوس

مہرِ نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدحِ بادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا دردِ دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطابِ زمیں بوس رکھا ہے۔ اس کو کسی قدر حذف اور اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

تاآں شیوہ خاقانانہ و خواقین خدائیگانہ! روی آوردنِ من از عدم بوجود بسودِ دلے گہرسنجی و گہرفروشی بود، کالاے بیش بہاے من درین چارسو روی روائی ندید و متاعِ گرانمایۂ مرا درین بازار ارزش ارزانی نہ شد۔ ناچار ہرچہ باخویش آوردہ ام چوں گویم کہ باخویش می برم نہفتے در سفینہ ہا و پارۂ در سینہ ہا می گذارم و می گذرم پس از من آں گنجِ شائیگاں را اگر ہمہ باد ببرد گو ببرد و اگر ہمہ خاک بخورد گو بخور۔ سینہ آرزوہاے جواں میرا مدفن ست المنۃ نگاہِ کرم چراغِ گورِ غریباں باد۔

نیاکانِ نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماندہانِ با فرو فرہنگ۔ فرو مردنِ چراغِ ہستی نورِ دیدۂ تور بہ بادِ آستینِ کینۂ کیخسرو پشنگیاں را روزِ سیاہ پیش آورد۔ خداوندانِ اورنگ و دیہیم را ازاں برگ و ساز ہا جز تیغ گندناگوں یک نماند۔ بمرز و بومِ بیگانہ روی آوردند، و بدستِ مزدِ تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازیں نیستان ایوانانِ کہسار نشیمن، سلجوقیاں دگر بارہ سر بافسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردندہ چنانکہ خوی اوست ایں نامدارانِ کاؤس کوس را نیز از پای افگند:

در مشربِ ما خواہشِ فردوس نجوئی　　در مجمعِ ما طالعِ مسعود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی　　در آتشِ ہنگامۂ ما دُود نیابی

از والیانِ ایں قافلہ نیاے من کہ قلمروِ ما ورالنہر، سمرقند شہر، مسقط الراس وے بود، چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید، از سمرقند بہند آمد۔ در دفترِ پیشینیانش نشانِ ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں توقیعِ نوکری شاہش نوشتند و پنجاہ سوار براتِ روزیِ وے و سپاہش نوشتند۔ پدرم پیشۂ پدرِ خویش داشت، و ہم در کارزار جامہ گذاشت۔ ہمانا گلبنِ نسلے را نوآئین نوا بلبلے بمی بایست کہ مرا زمزمہ سنج و دستاں سراے آفریدند۔

رباعی

غالب بگہر ز دودۂ زادشمم　　زاں رو بصفاے دمِ تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر　　شد تیرِ شکستۂ نیاکاں قلمم

[illegible] آزادہ روی بسخنِ لاابالیانہ پرداختم، و اندازۂ ارزش

سخن و پایهٔ والای گوهرِ خویش نشناختم. سینهٔ من نفسے داشت. بروانِ آسانیِ نسیمے کہ از نسترن زار وزد، با زبان نزده. من کہ دم جز بہ نابایست نزدم، و بنانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باریِ ابرے کہ از قبلہ خیزد بیہده کوش. من کہ باراں بشوره زار فرد ریختم.

با ایں فروغِ گوہرِ درخشانیِ نہاد زیں سال سیاہ روز کرا کرد روزگار

با فرّ و فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگاں ہمنشیں و با اوباش ہمرنگ، پاے بیراہہ پوے و زبانِ بے صرفہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار، دل پُر از خار خار، و دیده نشترزار نگار، نہ دستگاہِ خودنمایانہ آرایشے، و نہ سر و برگِ آزادانہ آسایشے. سرگذشتِ ہر کس ہماں فرمان ہاے امضا پذیرفتہ، سرنوشتِ اوست؛ در آنچہ بر من رفت، دوستاں را با من چہ جای سرزنش، و مرا با دشمناں چہ گنجائی گنجایش پرخاش.

لنگر گسستہ صرصر و کشتی شکستہ موج دانا خورد دریغ کہ نادان چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیِ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکده را بیکدگر زد، بفروغِ آں فرّهٔ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرّ تاب دادگری دل افروخت، و مرا فرہنگِ سخن گستری آموخت، بداں درِ فرودم آوردند کہ تو نیز چوں حلقہ، چشمے بداں در داری، و نتوانی کہ دیده برداری.... تا ہمسایهٔ اُدیم، سپہریاں در سایهٔ من اند و تا خاک نشینِ آں دَرم، فرشتگاں در رشکِ پایهٔ من اند. در دل و دیدهٔ روشناں جاے من ست و بر سر ماه و ستاره ستارگان پاے من. دریں گوشہ گزینی و خوشہ چینی نخست آیهٔ رحمتے کہ بر من از بالا فرود آمد، رُو دادنِ خجستگیِ زمیں بوسِ کیہاں خدیوِ خدادان بود. دولت رُو آورد، بخت از خواب جست، حور چشمِ روشنی گفت، رضوان بہ رضاجوئی آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ بحِلّی طلبید.

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر تلافی نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کالبدِ خاکیِ مرا چوں پیکرِ گرد باد جانے در میان نیست؛ ہمیں یک دو دم سرگشتگی تماشا دارد. مگر عندلیبِ گلشنِ تصویرم کہ بوے گل زمزمہ از وے نتواند دمید، یا سبزهٔ جوہر

شمشیرم کہ بوزیدنِ بادِ مستانہ نیارد چمید۔ گسستگیِ پیوندِ نشاط کہن شد، و خون از دلِ ہجران درچکیدن ست، تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بزور گسستہ اند

شبے با دلِ دیوانہ کہ لختے از من ہوشمندتر است، گفتم کہ اگر گفتار نیرو دہی المشاہ ارم کارگاہ بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینۂ رازم، مرا می تواں زدود؛ و بندۂ سخن طرازم، مرا می تواں پرورد۔ گفت، اے ناداں! ایں سخن از جاے دگر بود و ہنگام آں گذشت! اکنوں اگر ہمی توانی گفت بگوے کہ خستہ ام، مرہم می تواں نہاد؛ و مردہ ام، جاں می تواں بخشید۔

رباعی

شاہا! ہرچند طرب جوے آمدہ ام   دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام
آبم کہ محیط را بجوے آمدہ ام   رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بیدلانِ توام، بروزگارِ فرزانہ جمشید بودمے، جمشیدِ روزگار را آفریں گفتمے؛ و اگر بدانساں کہ ثنا خوانِ شہریارم، فرخ فریدوں را ستودمے، فریدوں چرخ و ستارہ را گردِ سر گشتے۔ و دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت، و ژند آورد، اگر من بدیں دمِ آذرفشاں جا داشتمے، آذر از بیمِ من زبانہ نہ زدے۔ و از دلفریبیِ بیانِ من کس بشنیدنِ ژند نپرداختے۔ من بدیں فرخیِ بخت کہ چوں تو خداوند کارفرماے دارم، ہر قدر بر خویشتن بنازم، جا دارد، سرت گردم! تو نیز بدیں گرمیِ ہنگامہ بناز کہ ہمچو غالب بندۂ آتشیں نواے داری۔ اگر بہ اندازۂ ہنر دادِ التفات می دہی، جاے در مردمکِ دیدہ بمن بازگزار؛ و درِ دل بروی من بکشاے۔

گویند، در عہدِ جہانبانیِ حضرت صاحبقرانِ ثانی بفرمانِ آں خسروِ دریا دل کلیم را صلہ بسیم و زر، لعل و گہر سختہ اند۔ من آں خواہم، دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش و کوشش نہ رنجند، و یکبار گفتارِ مرا با کلامِ کلیم بسنجند۔

پریشاں نوائیِ من در ستایشِ گفتارِ خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتارِ راست گستاخی گر بودن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے، و ہیچ گاہ بر خود گمانِ کمالے نبردمے۔ سرمستیِ ذوقِ پرستیدنِ ایں والا نظر کہ برگزیدۂ تست مرا از من برُد، و خامۂ بے پروا پوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش درامش آورد

..... ہمانا بلند نامیِ سلطانِ دہر در آفاق چشم داشت کہ چوں نے را آں کہ بجادو بیانی

شہرہ آفاقم بکردارِ گزارش گماشت۔ من خود ازاں رو کہ دل و زبانِ ایں بیدار مغز آئینہ دارِ دل و زبانِ شاہ است، دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ، فرمانِ شاہ ست۔

بادشاہاں را ثنا گفتن نہ کارِ ہر کس ست   دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندازد بمن

نامہ نگارِ کردار گزار را بہ تنومندیِ توفیقِ سرانجامِ خدمت، سعادتِ جاودانی، و خاقان را بہ سایۂ سوادِ ایں نگارش کہ ظلماتِ آبِ حیواں ست، حیاتِ پایدار ارزانی باد۔

فخریہ فقرے مرزا نے مہر نیم روز میں جہاں سببِ تالیفِ کتاب لکھا ہے اس کے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسرِ نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرزِ بیان کی داد لوگوں سے چاہوں، تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی، بلکہ عین تقیہ و تمیز کی بات سمجھی جائے گی۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

کالا شناسی را نہ آں آیین ست کہ نکوئی کالاے خویش از نظر اندازند، و پیکار کشائی را نہ آں دستور ست کہ بر ہر پیکرے کہ خود کشند، عشق نہ بازند۔ گرانمایگی آں نقش را کہ خودی زد، از اعجاز نمی شمرد بہ آذر آں بت را کہ خودی تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بندۂ سپاس گزار باشم، اگر قلم را بہر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم۔ رفتارِ کبک و تدرو دل از دست برد، و خرامِ ایں رعنا لعبتِ رقاص سرمست نکند؟ حاشا کہ خراشِ کلک بر ورقِ آب را بہ ذوق انگیزی تواند بود، تیر ست کہ ببستہ در حالتِ سرمستی تصمیم خودنمایانہ بنازی خرامد۔ ایں پارسی آمیختہ بہ تازی کہ از زبانِ چیرہ دستیِ عرب بہ عجم در گیتی پدید آمد، خسروی گنجینۂ در بستہ بود کہ خامۂ من قفلِ درش را کلید آمد۔ پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام:

خسروی بادہ دریں دور اگر مے خواہی   پیشِ ما آے، نہ جرعۂ از جامِ جم ست

خودستائی فرو ہلم، و بندِ پندار بگسلم۔ آوخ، ازاں روزگار کہ از خوی بناسازی و از کار ربانی سپری شد! و داد ازاں بے داد کہ در ریزش افزونیِ خشم و کام بر روان و ہوش رفت۔ از کار فرماے ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بپرداختنِ ایں نمط کہ خود را چوں سایہ با زمیں ہموار ساختہ ام، تا پرداختہ ام، و بانگیختنِ ایں نقش کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام۔ دست از کارہاے دگر کوتاہ است و دل

از اندیشہ ہاے دگر بر کنار۔ نامہ نگار کہ از کردار گزاری بگفتن دردِ دل روے آوردہ بود، باز بہ پاے سخن می آید و جادہ کہ نشان دادہ اندی پیماید، نگرندگان ہمہ تن چشم باشند، و شنوندگان سراپا گوش

طرزِ واقعہ نگاری مرزا نے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں، یہاں دو ایک مثالیں اس کی بھی لکھی جاتی ہیں:۔

از روداد قبل خان کہ از نیاگانِ امیر تیمور بود

خانِ خطا باخویشتن سنجید کہ با قہرمانِ قوم مغل مہر ورزد، مہر انگیز نامہ رواں داشت، و گزیدہ روشنے را بہ نامہ بری و میانجی (یعنی ایلچی) گری گماشت۔ فرستادہ آمد و جہان پہلوان قبل خان را زمین بوسید، و نامہ سپرد و پیام گزارد۔ صرفہ در آشتی (یعنی صلح) بود سنہ در فرو گذاشت۔ تاتولی بہادر را بجاے خود نشاند و بہ ہمعنانیِ نامہ آور، توسنِ تیز گام سوے خطا راند، و فرمانروا آں (نام برادر قبل خان) کشور سرانِ لشکر را پذیرہ فرستاد و مہمان را بخوشترین نشیمن فرود آورد۔ آوردہ اند و پادشاہ و مہر بارگاہ بر یک خوان نشستند (استقبال) و نان خوردند، و در اوّل آشامیدند مگر خرد پیشہ قبل خان را در اندیشہ گذشتہ باشد کہ مبادا خطائیان زہر بہ بادہ آمیزند، و بدیں (شاید) رنگ خون مہمان ریزند، در ہر بزم پس (اہلِ خطا) از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن (شاشیدن) بروں آمدے، و بہ ستم شگوفہ (یعنی در ہر صحبت) (یعنی قے کرتے) گردے، و خوردہ آشامیدہ از دہن فرو ریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے، دگربارہ ساغر گرفتے، و خوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فرمانند کہ یارب! ایں چہ نیرومند زور آور کسی ست کہ از ما بیشتر میخورد و خورش را بجُفے گرانی نیست، و مے از ما فزوں تر میکشد و ہشیار تر از ماست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادۂ پُر زور دمادم خورند، ہر چند ہر بار شگوفہ اندازند، نہ آنست کہ مستی روے نہد، و تابِ مے دیر پوئیِ تے منش را بہم برزند شبے بادہ بر خرد زور آورد قبل خان ریشِ دارندۂ خطا کہ آلتان خان نام داشت گرفت و بسوے خود کشید و ناسزا گفت۔ میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکانِ خود را کہ بہم برآمدہ بودند، از گستاخی باز داشت۔ بامداداں مہمان آہنگِ بازگشت سرود (ظاہر کرد)

میزبان کہ از بدمستیِ دوشینہ سرگران بود، چنانکہ میزبانان دامنِ مہماں زود از دست ندہند، و آرزوے دیر ماندن کنند، نکرد۔ کلاہ ہاے گوہر آگیں، و کمرہاے زریں، درخشندہ نگین ہاے بیش بہا و بستہ (یعنی پٹکے) ہاے پرنیان و دیبا

پیش کشید، و پدرود کرد۔ ہنوز رہرو رہ دہ نہ رفتہ بود کہ بدآموزان التان
رخصت — یعنی قبل خان
خان را از جاے برند، و بداں آوردند کہ قبل خان از راہ برگردانند، و بدرگاہ
اعضا کے بند
آوردند، و کالبدش را بدشنہ و خنجر از ہم فرو کشایند۔ سخن بہ نرمی گزارندہ ستارہ
از سپہر فرود آرندہ۔ بدیں کار کمر بست و قبل خان را براہ دریافت، بباز آمدن
فریفت۔ رمیدہ رام نہ شد، و از راہ برنگشت۔ فرستادہ تنہا باز آمد و بفرستندہ
خبر داد۔ بگروہے از گردان و یلان فرمان رفت کہ جلو گسیختہ شتابند و
بگشت
ہر کجا یابند اگر بشادی و رادی نیاید، بخواری و زاری آورند۔ مگر قبل خان
آرمیت
را با او دوستی بود از دودۂ ستودۂ سلجوق، بکاشانۂ وے فرود آمد
دانم از بہر آسایش آہنگِ دو سہ روز آبخور داشتہ باشد، خطائیانِ شوریدہ
اقامت
مغز دراں دہ رسیدند و خان را دراں خانہ دیدند۔ سخن بداں پایہ ساز کردند
چرب زبانی
کہ خاقان فریب خورد، و خواست کہ بسوے خطا برگردد۔ خانہ خدا کہ خرد نہ
میزبان
مہر فزوں داشت، نہفتہ باد پاے پیش کشید و گفت، کارہا دگرگون ستما
رفتن بخطا خود بہیچ روے روا نیست۔ تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں بادِ
توسن نام بر نشین، و سوے ایل و اولوس بگریز۔ ناگزیر ہمچناں کرد، و
قوم و قبیلہ
جانِ گرامی بہ تیزگامی بُرد۔ خطائیان روے بازگشتن نداشتند، پے امیدگاہ
تگاپوے خویش، بر داشتند۔ خانِ سپہر آستان نخست بآرامش جا رسید و خطائیان سپس
یعنی فوج کے سپاہی
با فاجولی بہادر و فرزانگاہ لشکر سگالش رفت کہ چہ می باید کرد انجام کار بہ ہمدیگر
[illegible]
یکدگر بدخواہاں را کشتند، تا از تحریک کشتہ چہ در روند۔

یعنی دیکھتے ہی حرکت کا نام کیا ہو
شہریار قبل خان از یک بانوے نکو دیدار کہ از قوم قنغرات بود، شش
پسر داشت۔ نخستین و دومین بہ اوگین برقاق و قوتلہ خان نام آور، و دیگران
بنامہاے دگر روشناس۔ روزے نخستین ایں دو برادرِ نام آور ناگاہ بشکار
گاہ از ہمرہاں جدا ہمی ماند، و رہ گم کردہ ہرزہ ہمی گردد۔ تاتار خانیاں کہ
غارتگری پیشہ داشتند، و پیرامن قلمروِ مغول ہموارہ راہ می زدند، با ایں شہسوار
پریشاں رفتار بر می خورند، و چوں می دانند کہ کیست باسیری می برند و با التان خانِ
خطائی می سپرند۔ خان کہ دلے پُر داشت، فرمان می دہد کہ شہزادہ را بر خرِ چوبیں
یعنی جلا بیٹھا تھا
بہ میخ ہاے آہنیں بدوزند، و تن نازنینش از رواں پردازند۔ خداوندِ مغولستان

را که از پیش رنجور بود بجگر تابیِ این داغ درد افزود. چون دانست که ناکام (یعنی جلد) همی باید مُرد، دومین پسرِ خویش قویله خان را به جانشینی گزید. و به کشیدنِ انتقامِ خونِ برادر وصیت کرده، چشم از تماشاے جہان پوشید. قویله خان تا نگینِ سلیمان بکف آورد، بفراهم آمدنِ سپاه فرمان نبشت. فرمان بران و کینه خواہان از ہر سو به تختگاه رُوے آوردند:

شہنشاهِ دانا دلِ دیده ور — که چون لعل بودے سراپا جگر
بران شد که لشکر فراز آورد — بسوے خطا ترکتاز آورد
زمردان و گُردان و کُندآوران — به جنبش در آورد کوہے گران
از ان رو که بایست خونریز شد (یعنی اس وجہ سے کہ خونریزی ہونا ضرور تھا) — منش ہا بخون ریختن تیز شد
دلیران ز دشمن کُشی دم زدند — ز دم باد بر رُوے پرچم زدند
ز تاتار تا گرد انگیختند — به بنگاهِ خانِ خطا ریختند

التان خان دل و دست و عنان و سنان بکار آورد، و خود را با سپاہے از ستاره بشمار افزون تر، به پیکار آورد. کوشید و کوشیدن سود (موصوف) نداشت رقمِ فیروزی بنامِ قویله خان کشیده بودند. شکیبائی (صفت) گسل شکستے (موصوف) بر خطائیان افتاد، عَلَم ہا واژگون شد، و اندیشه بگریز رہنمون. جہان بان التان خان بگریختن جان بُرد، و تن ہاے خسته و دلہاے شکسته از میان بُرد. بشہر اندر آمد، و در برُوے سپاہِ کینه خواه بست. قویله خان و لشکریانش نه آنمایه برگ و ساز به یغما ربودند که در اندیشه گنجد. سپاس گزارِ چرخ و اختر گشتند و گرانبار و سبک عنان برگشتند. پادشاه بچشم روشنی پیروزی سپاه رعیت را صلاے عشرت اندوزی داد. ہنگامۂ جشن گرمی پذیرفت و بزمِ سور آرایش یافت. خواہی ہنگامه گرم کن و خواہی بزم آراے؛ مرگ را نه آن خدنگ به کمان ست که خطا کند؛ قویله خان را نیز بہنگامِ خویش ناوک بر نشان خورد. چون پسر نداشت برتان بہادر جاے پدر از برادر گرفت. بسکه دلیر و مردانه بود، نامش از خانی به بہادری در جہان رفت. بروزگارِ جہانداریِ این شہریارِ دلاور، برقِ اجل، خرمنِ ہستیِ قاجولی بہادر سوخت، و پسرش ایرومچی برلاس بسر لشکری (سپہ سالاری) رُخ افروخت.

پارهٔ از احوال امیر تیمور

روزے میانۂ امیر قزغن¹ و امیر طراغاے² دربارۂ اولوس و قشون سخن می رفت و فرزانۂ فیروزی فر امیر تیمور دلاور، با پدر ہمزبان بود۔ پدر را از گفتار باز داشتہ خود بشگرفی سخن سراے شد، و بداں ہنجار زمزمۂ چند برتلید گفتار زد کہ امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گہرافشانی بہمہ دل بست و با آفرین زبان برگشاد۔ سخن گوے فرو ہیدہ ادا را پسر خواند، و ہمدران بزم اولجایہ ترکان خواہر امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئینِ دین و قانونِ شرع بوے سپرد، تا خویشی بر خویشاوندی افزاید، و آمیزشے چوں شیر و شکر در میان آید۔ امیر جہانجوے پس ازاں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشین و ہمدم و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایانِ برلاس و دلاورانِ جغتا ہر کہ آں دست برد نگرستے "شگفتی فرو ماندے" "رو ستت مریزاد" گویاں دست و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ داماد ش تغلق تیمور ناگاہ در شکارگاہش کشت، جہاں پہلوان تہمتن تواں بہ تنہا دامنِ ہمتِ والا گرفت و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ   در عہدۂ رحمتِ خدائیم ہمہ
در جلوۂ دید چناں کہ مائیم ہمہ   شایستۂ لعنت و بلائیم ہمہ

برادر زنِ صاحبقراں ہماناں امیر حسین نیز بوے پیوست و عہد بست کہ ہرچہ از ملک و مال و برگ و ساز گرد آید، بہ یکدگر بخشش کنیم، و باہم جز مہر، و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نہ ورزیم۔ بخوں گرمی ایں دو گردِ دلاور و دو شیر مردِ ہم گہر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاہے و سترگ سپاہے فراہم آمد۔ صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگی دل با زباں یکے داشت و امیر حسین ہموارہ در کمینِ آں بودے کہ انباز را از میان بردارد، و بیکتائی علمِ دارائی افرازد، از دیدہ وری بسگالشہاے آں نژند اندیشہ ناراستی پیشہ پے بُردے و از فرزانگی و مردانگی ہیچگاہ بروے نیاوردے۔

ستم بجانِ کج اندیش می تواں کردن   خجل ز راستیِ خویش می تواں کردن

روزگارے دراز تر از رشتۂ طولِ امل، با ملوکِ طوائف در کجدار و مریز و ستیز و آویز گذشت۔ ہمگناں چشم براہ و گوش بر آواز داشتند، تا ایل اسفندیار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد۔ ویژہ امیر حسین کہ جز برلیو و غریو رنگ و نیرنگ

کارنمی کرد، و در انبازی و دمسازی، فتنه پردازی و شعبده بازی شیوه داشت
نیرنگ سازیِ اقبالِ عدو مالِ صاحبقرانِ کشورستان را نازم که هم آن گروهِ بے شکوه
را سو بسو پاے بسنگ خوردے، و هم این گردے و دستنبرد را جا بجا دست از کار رفته
صدمهٔ اتفاق افتاده است که این نفاق پیشگانِ خرد (یعنی امیر حسین) دشمنِ خون گرفته، را از نژادِ
چغتا خان دست گرفته بر تکیه گاهِ خانی و مرزبانی نشانده اند، و زود زود زیرِ شمشیر برهنه
مانده اند. تنهاے پیلتنان را مسند و نطع از پے هم مهیا بود، و سرهاے سروران را
نازِ بالش و خشتِ گور از پس یکدگر آماده:

سیرِ ستاره و روشِ چرخِ نیلگون — اینها کند هر آینه در مذهب حکیم
اما من آن نیم که پسندم طریقِ وهم — زاختر چه شکوه، چون نبود جز خدا فہیم
نبود بجز ظهورِ صفات و شیونِ حق — صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم
توقیعِ معزولیست گر انصاف ور ستم — تشریفِ خسرویست گر اطلس و گر گلیم
از حق بجا نهاده هستی بهر صفت — جز داده نبود آنچه به سائل دهد کریم

همچنیں بلدها امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتاده است و سلطان سام
هم آورده، افراسیاب همتا، برلابه گریِ وے بخشوده بیاری و یاوریِ دل نهاده است.
کینهاے نهانیِ امیر حسین آشکارا بود، همه می دانستند، و خدیوِ همه دان از همه فزوں تر
می دانست. دانم که در ضمیرِ حق پسندِ آزرم ناگزیر، می گذشته باشد که مگر این سست مهر
خوهاے زشت و کردهاے نکوهیده بگذارد و جهاندار را دگر بار راستی و جهانیان را سپس
به درازدستی نیازارد. آن ناجوانمرد را فرّهٔ ایزدی کجا که بخشم و کام نگرود، و راهِ دانش و
داد رود. در آزردنِ دل آزرم نداشت و در بُردنِ زر شکیب، و در کشتنِ خلق پروا.

تو پارسا طلبی عاشقِ دمکش آن منم — که مے بکامِ دلِ اوباش آشکار کشد

پایانِ کار، لشکریانش از ناخوشی ستوه آمده، آن جوان میر، خدا گیر را با هر چهار پسرش
گرفته آوردند، بخداوندگار سپردند. داراے نبرد آزماے را آهنگِ عاجز کشی نبود
و خون گریِ پاداش (یعنی جوشِ انتقام)، نداشت. می خواست بر نابخشودنی بخشودن،
و گناهان نابخشیدنی بخشیدن، از نهادِ اهلِ بزم خروش برخاست. خاصه شاه محمد مرزبانِ
بدخشان، و شیخ محمد بیان سلدوز، و امیر کیخسرو که ریشهاے نو و ناسورهاے کهن
داشتند. زخمه تیز تر زدند، و نواهاے خونچکانِ خونابه فشان فغان بر آوردند که ما قصاصِ

خون ہاے ریختہ می خواہیم، نہ انتقام فتنہ ہاے انگیختہ کہ والیِ ولایت آں را بحل توانند کرد۔ ناگزیر بدیں گفتار فرجامِ گیر و دار بشرع حوالت رفت۔ کار آگاہاں و دانش پناہاں خون ریختن فرمودند و سادات و علما بہ کشتن فتویٰ دادند۔

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد در دل اندیشیدہ باشد کہ خود را گریختن از ہنگامہ بدر برد۔ و سپس در زاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد۔ از آنجا کہ سلاح و سلب نداشت، سراسیمہ از جا رفت، و از خرگاہ بدر آمدہ بجنگِ سیلی و مشت رہِ گریز پیش گرفت۔ خون خواہاں بخوں گرمی اندوے آویختند، و خونش را کہ بدیں گرم شدہ بود، گرما گرم بر زمیں ریختند۔

تو ای نسیم کہ بانی ز تازہ روئی خویش بسبزہ کہ سر از طرفِ جوئبار کشد
فریبِ مہر ز گردوں مخور کہ ایں بے مہر دہد فشار کسی را کہ در کنار کشد
ہوائے تاجِ شہی ہر کرا بود در سر سرے بمدفنِ شاہانِ تاجدار کشد

پارۂ از احوالِ ہمایوں و شیر شاہ

شیر خاں را دل دگر بود و زبان دگر، بہ لابہ گری و فسوں گستری پیامِ آشتی در میان داشت، تا چناں شد کہ ہیچ کس را ستیزہ در اندیشہ نگذشتے۔ از آں گل و لاے کہ در راہ بیہودہ بودند، و روز و شب از رہروی، نے نے از شناوری آسودہ بودند، پیادہ آزردہ پاے بود، و سوار فرسودہ اندام، و ستور پشت ریش۔ فریبِ دوستی از دشمن خوردگان (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراجِ اقلیم کشیدند، و دمِ آسایش غنیمت شمردند۔ پاہا بہ جادۂ زہ دامن آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکرہا چوں صورتِ دیبا بہ بستر پیوند پذیرفت۔ سر از بالش بر نمی خیزد تا کلاہ و مغفر را چہ کنند، و پیراہنِ حریر بر تن گراں ست تا چلقد و جوشن کجا برند۔ ہوا نمناک بود، و ابر رشحہ فشاں؛ تیغ در نیام زنگ بست، و نمدِ زیں بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دمے کہ تیرگی تارِ صبح جہاں را فرو گرفتہ بود ہنگامہ سازاں ہنگام جوے یکسرہ بر غنودگاں ریختند۔ شگرف سراسیمگی پدید آمد طرفہ ہزاہز در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمر و پاردم از افسار نشناختند۔ از رختِ خواب جستہ و بر اسپانِ بے زیں نشستہ، پراگندہ ہر طرف تاختند۔ گروہے "ہر چہ بادا باد" گویاں سوارہ خود را بدریا زدند و ہر دوے چند ساحل جویاں بہ شنا

دست وپا زدند تا کداماں بزخمِ دمِ تیغ وکداماں بہ خمِ موجِ رود مُردہ باشند

کداماں از طوفانِ ایں دو آبہ (یعنی آبِ تیغ وآبِ رود) جاں بسلامت بُردہ باشند۔ شہنشاہِ بحروبر (ہمایوں)، نہنگِ دشت نورد دریاشگاف (یعنی اسپ) را از فرازِ ساحل درآب افگند۔ پلے از رکاب، وعناں از دست، واسپ از خمِ راں بُدر رفت۔ وشاہ سوارے کہ شاہاں ہنگامِ سواری بوسہ بر رکابش می زدند، غوطہ درآب خورد۔ نظام نام آزادہ از آب کشانِ لشکر کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم براہ وگوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد، منتظرِ عروج واقبالِ خود بود) وباخویشتن دریں اندیشہ کہ از ساحل چوں گزرد، بر ساحل جا داشت، ہوا خواہانہ بداں چستی، کہ گوئی گوے دولت بُرد، خود را بآب در زد۔ بارے بدانستِ آشکارا بیناں سقّاے سخت کوشے بود، و بہ والا دیدِ معنی آشنایاں فرخ سروشے بود کہ جہانباں را از گرداب بدر آورد و بر جہانیاں منّت نہاد۔

از دستنبوہ

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں، لیکن کتاب دستنبوہ میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے، التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبوہ میں اپنی طرزِ خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبوہ کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں:

غدر کے اسباب

دریں روزگار کہ ہر زمزمہ را ہنجار وہر ہمہمہ را رفتار، وہر کجا سپاہے بود از سپہدار، سخن پیوندی بگذار وبگوے کہ خود در روز در روزگار، برگشت۔ اختر شناسانِ سپہر پیماے (یعنی منجماں) برآنند کہ دراں روزگار کہ بزمِ نازِ یزدجُرد شہریارِ پارس از ترکتازِ تازیاں (اہلِ عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) وبہرام (مریخ) در خرچنگ (بُرجِ سرطان) انجمن آرائے وہنر آزماے بودند۔ اینک ہماں پایہ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہ (جاے قران) بہرام وکیواں ست وایں شورش وپرخاش وجنگ وخواری وخونخواری، ودرنگ ونیرنگ نمایۂ (ظہور) آنست۔

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختنِ لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر، وایں برگشتنِ لشکر ست از خداوندانِ لشکر، چناں کہ از داستانِ باستانِ پارسایانِ پاک بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو ستیز و آویز ہویدائی دارد۔ دراں بار کہ سخن در کیش بود، ایرانِ ویران بہ خرد و فرہنگِ کیشِ نو (یعنی اسلام) فرجام آبادی واز بندِ آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ دریں بار کہ گفتار در آئین ست، ہندیاں بہ چشمداشتِ کدام آئینِ تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں رُخ از آتش تافتند، وبسوئے خدا راہ یافتند۔ ہندیان دامنِ دادگراں (یعنی اہلِ فرنگ) از دست دادند، وبشکنجۂ دامِ ہمدمیِ دداں (درندگان) افتادند۔ نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دَد چہ مایہ دوری ست، داد آنست کہ آرامش (راحت) جز در آئینِ انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخمِ تازیانۂ تازیاں از خوبیِ آں کیشِ فرخ (اسلام) مرہمے داشت، روزگار در نوردِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت، بارِ اندوہ از دوشِ اہلے نژند (پریشان و تباہ) برمی داشت۔ اگر در اندیشۂ رازدانان بہ ہر دانش و داد، ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست، بمن نشان دہند، و بر دلِ اندوہگینِ بیمناک سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباناں ستیزند و لشکریاں خونِ لشکر آرایاں ریزند؛ وانگاہ شادی ورزند، و بر خویشتن نہ لرزند۔ ہاں، اے دانندگانِ فرزبود (حکمتِ الٰہی) و شناسندگانِ زیان و سود، ایں ہنگامہ بہ آتشِ خشمِ خداوند گرم است ورنہ کارزارِ پارس اینچنیں امید سوز و آرزو گداز نہ بود۔

کیفیتِ شورشِ باغیان در دہلی

چاشتگاہِ دوشنبہ شانزدہم ماہِ روزہ و یازدہم مئی سال یکہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفت در و دیوارِ بارہ و بارۂ دہلی بجنبید و آں جنبش زمیں را فرا گرفت۔ سخن در زمیں لرزہ (زلزلہ) نمی رود، در آں روزِ جہاں سوز، بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہِ کینہ خواہِ میرٹ بشہر در آمدند۔ ہمہ بے آزرم و شور انگیز، و بخداوند کشی تشنۂ خونِ انگریز۔ دیدبانانِ دروازہ ہائے شہر کہ بُردن (علاوہ) از ہمگوہری وہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ از پیش ہم سوگند نیز باشند، ہم پاسِ نمک

وہم پاسبانِ شہر گزاشتند و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند آں سالارانِ سرگرانِ سبک جلو و سبک عناں) و پیادگانِ تندخوے تیزدَو چوں درہا بازو دربانان را مہمان نواز یافتند، دیوانہ وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں و ہر کجا آرامشگاہِ آں مہان یافتند، تا زار نگشتند و پاک نسوختند، روے ازاں سُوے برنتافتند۔ مشتے گدایانِ گوشہ گیر از بخششِ انگریزی توشہ گیر کہ نان پارہ و دوغ می خوردند و در شہر دور از یکدگر پراگندہ جابجا روزگار بسر می بُردند (یعنی رعایاے شہر)، ہمہ تیر از تبر ناشناسندگان و از غوغاے دزدِ تیرہ شب ہراسندگان نہ پلاکے در دست، و نہ خدنگے در شست، اگر راست پُرسی، ایں مردم بہر آبادیِ کُوے برزن اند، نہ براے آنکہ بہ آہنگِ پیکار دامن بہ کمر زنند، با اینہمہ ازاں رُو کہ راہِ آبِ تیز رَو بہ خاشاک نتواں بست، دست از چارہ کوتاہ دیدہ، ہر یکے در سراے خویش بماتم نشست یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در خانۂ خویش بودم، چوں غریو و غوغا شنودم، تا از پژوہش دم نزدم۔ دراں مایہ درنگ کہ مژہ برہم زدم، آوازہ بخوں غلطیدنِ صاحب اجنٹ بہادر و قلعہ دار در ارک (قلعہ) و دویدنِ سواراں و پیاپے رسیدنِ پیادگان در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت۔ ہیچ مشتے خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغوان زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانا بد خمرۂ نوبہار نشد۔ ہاے! آں جہاندارانِ داد آموز، دانش اندوز، نکو خوے، نکو نام، و آہ، ازاں خاتونانِ پری چہرۂ نازک اندام، با رُخے چوں ماہ و تنے چوں سیمِ خام، و دریغ، آں کودکانِ جہان نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بر لالہ و گل می خندیدند و در خوش خرامی بر کبک و تذرو و آہو می گرفتند کہ ہمہ یکبار بگردابِ خوں فرو رفتند۔ اگر مرگ بہ بالینِ ایں کشتگان بمویہ (بگریہ) خروشد، و دریں سوگ سیاہ پوشد، رواست، و اگر سپہر خاک گرید و فرو ریزد، و زمین سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد، بجاست:

اے نوبہار! چوں تنِ بسمل بخوں بغلط　　اے روزگار! چوں شبِ بے ماہ تار شو
اے آفتاب! روے بہ سیلی کبود کن　　اے ماہتاب! داغِ دلِ روزگار شو

بارے چوں آں روزِ تیرہ بشام رسید و گیتی تاریکتر گردید، سیہ درونانِ خیرہ کش (بخیرگی کشندہ)، ہم در شہر جابجا رختِ تن آسانی انداختند، و ہم در ارک باغِ خسروی را آخر اسپاں و نشیمنِ شاہی را خوابگاہِ خویش ساختند۔ رفتہ رفتہ از

شہرہاے دُور دست آگہی رسید کہ شوریدگانِ ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ (منزل) خونِ سپہداں ریختہ اند۔ گروہا گروہ مردم را از سپاہی و کشاورز دل یکے گشت، وہمہ بے آنکہ باہم سخن رود، دور و نزدیک یکدست بر یک کار کمر بستند، وانگاہ چساں پُرزور کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبشِ جوشِ خونے کہ واز کرگند، کشاد نہ پذیرد۔ پنداری کہ ایں لشکرہاے بے مرد جنگجویانِ بے شمار را جاروب وار کمر بندیکی ست۔ آرے رُفت و رُوبِ ہند بُوم بداں ساں کہ رامش وآسایش اگر جویند باندازۂ پرِ کاہے گاہے نیابند۔ ہمچنیں جاروبِ گیتی آشوب آمیخواست۔ اینک ہزار لشکر نگری، ہمہ بے لشکر آراے آراستہ، و بسا سپاہ یعنی یکسو بے سپہدار بجنگ برخاستہ۔ توپ و گلولہ و ساچمہ (چھرّا) و بارود ہمہ از خانۂ انگریز آوردہ، و با گنجینہ داراں رُوے بستیز آوردہ، آیینِ نبرد و ورزشِ پیکار ہمہ از انگریز آموختہ و تیغ بکینِ آموزگاراں افروختہ۔ دل ست، سنگ و آہن نیست، چرا نہ سوزد؟ چشم ست، رخنہ و روزن نیست، چوں نگرید؟ آرے ہم بداغِ مرگِ فرماندہاں باید سوخت، وہم بر ویرانیِ ہندوستان باید گریست۔ شہرہاے بے شہریار پُر از بندہاے بے خداوند، چنانکہ باغہاے بے باغبان پُر از درختانِ بارومند رہزن از گیر و دار آزاد و بازارگان از تمغا، خانہا ویرانہا، و کلبہا (دکانہا) خوانِ یغما۔

از دیباچۂ ثانی درفشِ کاویانی

غالبِ خاکسار ہرزہ کار را از آسمان بہ زمین فرستادند و فرمان دادند کہ در پیشہ پیشۂ کشاورزی (کاشتکاری) ورزند۔ و ایں فرازماں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندند۔ ناگزیری بایست (ضرورت تھا)؛ کمر بستن و زمیں خستن، گاو راندن و دانہ افشاندن۔ ناداں (کشاورزی نکرد بلکہ)، بہوس در زمینِ غزل جاں کند و از ان گہرہا کہ با خویش آوردہ بود نیمہ در ایں زمین پراگند۔ ہمانا (گویا)، از ہر دانہ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت از مروارید کہ در خاک نہاں کند۔ تنیمہ کہ ریشہ سر بزند کاش جُو کاشتے، تا شود برداشتے! دانست کہ ہمہ را خاک خورد (یعنی تلف شد)، ناچار نیمۂ دیگر را پیشِ شاہانِ روزگار بُرد۔ دیدند و پسندیدند و نخریدند۔ شبے با یکے

انداز دانانِ پرورش (پرستش)، رفت کہ در مبدأ فیاض بخل نیست، ابر بر باغ و راغ و دمن و دِمن یکساں بارد، چرا ست کہ مردم چندے نادار اند، و چندے توانگر اند۔ گفت راست گفتی، توقیعِ سرنوشت ہا یکے ست (یعنی یکسانست)، جداشاک (ما بہ الامتیاز) اگر ہست، جز ایں نیست کہ کاردبار گاہے از ہر یک بر یک ورق، دوزد سازِ جرگہ (گروہے)، از ہر کس بر یک صفحہ نوشتہ اند۔ آنان ورق از دفتر با خویش آوردند و براتِ روزی از ہر در کہ مقدر بود، بُردند۔ اینان ازاں رُو کہ انفکاک صفحہ از ورق صورت نہ بست، تہیدست آمدند، و تہی کیسہ زیستند۔ گفتم، از چیست کہ، در چار سوے دہر، ع

بختِ صلۂ مدح و قبولِ غزلم نیست

گفت، آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردۂ، و ایں از انست کہ سخنہاے بلند داری، و بہ ناشناسا زباں (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی۔ گفتم، چہ کنم، تا از اندوہ باز رہم؟ گفت، شکیب وَرز و خوں گری، و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدۂ، می گوے ؎

کس زبانِ مرا نمی فہمد
بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نشان دادنِ اغلاطِ برہانِ قاطع سپاس منخواست، نہ ستیز، در قلمروِ ہند کس نماندہ باشد کہ مرا بدیں نیکی بد نخواندہ باشد۔ یکے خنجر آورد کہ من قاطعِ قاطع برہانم، دگرے اخگر آورد کہ من محرقِ آنم۔ کیست، تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدن و دوختنِ کاغذ جز فغان و دُخان چہ خیزد؟ بزہ مند (گناہگار) منم، اگر در آتش فگنند، وَر بہ تیغ دو نیم زنند، بہر دو گزند درخورستم (یعنی لائق ہستم)، و بہر دو سزا سزاوار...

سخندانِ راستی جوے را بایستہ آنکہ از ہر کتابِ فرہنگ عبارتِ جامع آں را بداں نگاہ تیز نگرد کہ از بس تیزی در جوہرِ لفظ فرو رود تا چگونگی پیوندِ الفاظ کہ انگیزشگاہِ معنی ست، آشکار شود۔ ہرگاہ آں را ہنجارِ اہلِ زبان نہ بیند، داند کہ در سوداے زباندانی جز زیاں نمی بیند۔

دگراں دانند و کارِ آناں، مرا نیز خردے و روانے دادہ اند۔ فراز آوردۂ (پیش آوردۂ)، اندیشۂ بیگانگاں را چوں پذیرم؟ و از نیروے خردِ خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیرو فزاے دانشِ من دانشمند کسی ست کہ اگر چنانکہ

رازداں بود، رازگوے نیز بودے، ششمیں سالش بشمار آمدے:

زخویشاں بہ بیگانگی شادمانم   سنانم بکس، چوں بکس مے نمانم؟
غریبم ولے روشناسِ عزیزاں   چنارِ سرافراز در بوستانم
گرفتم کہ از تخمِ افراسیابم   گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم   رہ و رسمِ کشورکشائی ندانم
بمیدانِ معنی خداوندِ رخشم   بمضمارِ پہلو زباں پہلوانم
دو سی سال توقیعِ معنی نوشتم   سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطع برہان کہ صنعتِ نقشبندِ خیالِ من بست، نہ نامۂ اعمالِ من ست کہ در آں جہاں بمن خواہند سپرد، ہم دریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلامے چند بفزایم و ایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام، اسپس درفشِ کاویانی خطاب دہم:

نازم بہ خرامِ کلک و طرزِ رقمش   ماناست ز تیزی بدمِ تیغ دمش
چوں اسمِ کتاب قاطعِ برہاں بود   گردید درفشِ کاویانی علمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودنِ سخنہاے ریزہ (متفرقہ) جز افزودنِ ہوش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد۔ یاراں جفا کنند، و من بہ ازاے ہر جفا (بعوضِ ہر جفا) وفا ورزم۔ ہمانا نکوئی و بہیِ یاراں خواہم و بس۔ بند نہند، پند دہم۔ داد دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم۔ سنگ زنند، ثمر بارم۔

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں، ان میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے۔ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔ فقروں اور ان کے اجزا میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔ اکثر جگہ صفاتِ متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفاتِ مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں، اکثر استعمال کرتے ہیں۔ پس سوا اس کے کہ یہ نثر میں شعر کے اوزانِ مخصوصہ سے جن کو اس کی ماہیت میں کچھ دخل نہیں، معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے ان پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے۔

چوں کہ یہ نثریں مرزا نے خاص کر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافتِ طبع کے لیے لکھی ہیں، اور ان میں اپنی نوآئین طرازی اور نادرہ سنجی کا جیسا کہ چاہیے، حق ادا کیا ہے۔ اس لیے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے، عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے، اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائے گا، جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا۔ لہٰذا ان نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائے گا، جس سے مرزا کی ان جزیل و گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لیے ہم اوّل بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب "پنج آہنگ" کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبانِ فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں، اس کے اوّل میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مضمونِ مذکور کی نسبت لکھتے ہیں: "زمینِ شور کہ چوں ذوقِ مے در طینتِ زاہد، ہیچ گلبن را در آنجا ریشہ در خاک نہ دَوَد، و خاکے نا استوار کہ ہر دیوار کہ دراں ریگستان برکشند، پیش از سایۂ خود بخاک افتد۔"

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ دیوانِ مذکور اور اس کے نوادر افکار میں آورد اور تصنّع یا کسی استاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے، اس طرح ادا کرتے ہیں: "بنامیزد (یعنی چشم بد دور) نخستیں نقابے ست از روے شاہدِ ہر صفت کردۂ معنی بجنبشِ نسیم برافتادہ، یعنی ننگِ کشاکشِ دست ناکشیدہ، باز پسیں چراغیست از گرمیِ چراغانِ نیم سوختہ، پہلو رُخ بافروختن دادہ یعنی داغِ منّتِ نفس نادیدہ۔"

ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اس کی بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا، اس طرح بیان کرتے ہیں: "سخن آفرین خداے گیتی آراے را ستایم کہ تا نہانخانۂ ضمیرم را از فراوانیِ

رنگا رنگ معنی بہ لعل و گہر انباشت، بازوئیم را ترازوے مرجان بخشی و خامہ ام را ہنگامۂ گہرپاشی ارزانی داشت۔"

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ہدیۂ ناظرین باتمکین کرتے ہیں:

از دیباچۂ دیوانِ فارسی

دیوانِ فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھ کر میرے حسنِ بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں، اس طرح بیان کرتے ہیں:

"لاے خمِ میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگان سگالند کہ ہیچدانے را ایں مایہ سیرابیِ نطق از کجاست، غافل کہ نم رشحۂ یک فیض است کہ سبزہ را دمیدن، و نہال را سرکشیدن، و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمہ آفریدن آموختہ و بہ پرتو ہماے ازلی ہدایت تنگبیں نگردگان اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را ایں ہمہ روشنائیِ گفتار چراست، بیخبر کہ فرۂ تابش یک نور است کہ شمع را بشعلہ و قدح را بہ بادہ و گل را برنگ و درون را بسخن برافروخت......

داغم از کوتہ نظرانِ تنگ چشم کہ دمیدنِ تازہ گل از گیاہ، و درخشیدنِ برق از شبہاے سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدنِ زبانہاے گویا بہ سخن ہاے نغز دشخوار انگارند۔ غنچہ مشکیں نفس است و باد غالیہ ساے، و گل کشادہ روے و بلبل نواسنج؛ زبان چہ گناہ کردہ است کہ سخن سراے نباشد۔ مہر جلوہ برتابد و ذرہ بیتابی و بحر روانی، و قطرہ آشنائی، دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید ہمانا بدانست ایں گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفانِ گزشتہ را تردماغ ساختہ، حالیا بساطِ بزمِ سخن برچیدہ، و جام و سبو بر سرِ ہم شکستہ، و ازاں قلزم قلزم راوق نمے برجاے نماندہ پندارند۔ کاش، با نجمنے کہ من در فرودیں رُدہ (یعنی صفِ پائیں) بحلقۂ اوباش قدح می گیرم فرارسند، تا وارسند کہ مے فراوان ست و ساقی بیدریغ بخش؛ پیمانہا جُرعہ ریز ست و لبہا العطش گوے۔ وللہ درُّ مَن قال:

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست   مے و میخانہ با مُہر و نشان ست

آرے صہباے سخن بہ روزگارِ من از کہنگی تند و پُرزور ست، و شبِ اندیشہ را بہ فرِ

دمیدنِ سپیدۂ سحری براتِ فراوانیِ نورست۔ ہر آئینہ رفتگان سرخوش غنودہ اند، ومن خوابستم؛ پیشینیاں چراغاں بودہ اند، ومن آفتابستم۔

اس کے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر ومباہات پر افسوس کرکے اس طرح لکھتے ہیں:

انصاف بالائے طاعت ست، در ہوائے کہ بالِ بالا خوانی (یعنی خودستائی) زدہ ام، و در ادائے کہ خود را شگرفی ستودہ ام، نیمۂ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی، ونیمۂ دیگر توانگرستائی یعنی بادخوانی۔ بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلفِ مرغولہ مُویاں کشودہ شود، بلا در من آویزد، تا دل بہ پیچاکِ آں شکن بندے؛ وخواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل واز خدا فارغے پر اورنگِ سروری کج نشیند، ہوسِ مرا برانگیزد، تا بہ پیشش بندہ وار راست ایستے۔ شادم از آزادی کہ لبا سخن بہ ہنجارِ عشق بازاں گزاردستم، وداغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدحِ اہلِ جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر لختے بچار وچنگ سرآمد، وپارۂ بہ دروغ ودریغ رفتہ فرجامِ گراں خوابی برنخاست، وآشوبِ ہوسناکی فرونشست۔

ازخاتمۂ دیوانِ فارسی

خاتمۂ دیوانِ فارسی میں اس بات کا عذر کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اس کے چھپوانے کی نوبت پہنچی، اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خودسر اور بلند پرواز تھی؛ اس کی روک تھام میں بہت سا وقت گذر گیا۔ اور اس مطلب کو اپنے طرزِ خاص میں یوں ادا کرتے ہیں:

ہان وہان رخشے بداں توسنی کہ عنانش مُوئے ومشامش بوئے برنتافتے

واز شموسی (سرکشی) گام بدرازی نہادہ جُز بہ پہنانہ نشناختے۔ از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ، وبہ لابۂ آواز بوسہ اش آرمیدہ داشتمے۔ چوں پارۂ از راہ بدیں گونہ کہ بر شمردم بُریدہ شد، در روز بلند گشت، ہم جوشِ تندیِ توسن فرونشست، وہم دست وپائے سوار از عنان ورکابِ خستگی پذیر آمد۔ تابِ مہرِ نیمروز، مغز در سرِ سوار گداخت، ونغنگیِ ریگِ بیابان، نعل در پائے تگاور نرم کرد۔ رانیض را دم وکرّہ را قدم بگداز آمد، ہم آں بہ آخر گرائید، وہم ایں را بہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سرآمد، ودر ہنگامِ گسستہ دمی خستگی روے آورد ... ... کیست، تا از من پُرسد؟ واگر نا پرسیدہ گویم، در دلش فرود آید کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزشہا (یعنی جنگہا)،

روے دادہ؛ و پس از آنکہ کار بدانجا رسیدہ کہ ہمگر از کونگی فرو مانند، بمیانجی گری توفیق بکدام قرار دادِ آشتی اتفاق اُفتادہ، خامۂ دیر جنبش بود و شوق زود گراے و جلد باز)؛ گفتارہا از نہیبِ دورباشِ اندیشہ بدر از نالے فاصلہ دل و زبان خون شد و اگر ناگہ از دل بزبان رسید؛ والّا بسیجِ ہمت آں را بانجامہ نسپرد۔ ہرچند منش (طبیعت) کریمانی سروش ست، و در سرآغاز نیز گزیدہ گوے و پسندیدہ جوے بود، امّا پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادروی) پے جادہ شناساں برداشتے، وکژی رفتارِ آناں را لغزشِ مستانہ انگاشتے۔ تا ہمدراں تکاپو پیش خراماں را خجستگی ارزشِ ہمقدمی (یعنی لیاقتِ ہمراہیِ خویش) کہ درمن یافتند، مہر بجنبید، و دل از آزرم (مروت) بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہاے من خوردند، و آموزگارانہ درمن نگرستند شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہرِ نگاہِ طالب آملی و برقِ چشمِ عرفیِ شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبشہاے ناروا در پلے روبپاے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمیِ گیرائیِ نفس (تاثیرِ کلام) حرزے بازوے و توشۂ بکمر بست، و نظیریِ لاابالی خرام بہنجارِ خاصۂ خودم بجالش (رفتار) آورد۔

از دیباچۂ دیوانِ تفتہ

دیوانِ تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قویٰ اور اپنے قلبِ ماہیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہاں اے غالبِ تیرہ روز و ژم اختر! کہ بدیں ہستی و کسائی شخصیت کہ تراست، بداں مانی کہ دانی، در عالمِ فرضِ محال سپندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ چہ مایہ جوشِ سوداست (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نفسے کہ می کشی، چوں خطے کہ از نقطہ برآوردند، ہمرنگِ سویداست۔ آں قلمروِ اندیشہ کہ از روانیِ خامہ و روانیِ گفتار آب و ہوا داشت، دَے تہش را زوردین پرستار بود، و چاشتنگہش را نسیمِ سحری پیشکار۔ بدیں ناخوشی و نژندی ویراں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دستِ تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روے داد کہ بہ دمیدن پردۂ شکیبِ نظارگیاں ندرد:

آں اثرِ پردہ سازت چہ شد زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں زجنوں پردہ کشائیت کو ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفسِ نارکمندت کجاست واں نگہِ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی درجواب گفتہ) کہ سوزِ غم دُود از دل برآورد، و گدازِ نفس آذر در زبان زد۔ یاد ہے کہ ہر آئینہ بگداخت و بازبانے کہ ہمانا نسوخت، عندِ غمزدگی مسموع نیست۔ بیا تا ہمیں دلِ بدزہرۂ الحذر نولے را بسخن نہیم، و ہمیں زبانِ کژنغمہ این المقرسرلئے را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظِ دیوانِ تفتہ بنگاریم)

زمن جوے رہ بدنکو زیستن جگر خوردن و تازہ رُو زیستن
سمن چیدن و در رہ انداختن دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر ہمگنان اظہارِ خوشحالی می کنم و اندوہِ درون را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم، تا بر ہیچ کس ظاہر نشود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں بہ شورابہ شستن زرخسارہ خوں
شگفتن زداغے کہ بر دل ربود نہفتن شرارے کہ در دل ربود

از تقریظِ تذکرۂ گلشنِ بیخار

ستایشِ سخن چشم بد دور، خمکدۂ سخن را شرابے ست پُر زور کہ زمین اناں بلائے (یعنی بلندی) و سپہر ازاں بہ بُوے آنچناں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرود آنند، شگفت نہ نماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر کا سب سے بڑا حصہ ان کے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں۔ اسی لیے ہم اس حصے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا، مشکل نثروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائے گا، اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

مرزا علی بخش خان فیروزپور جھرکے میں ہیں، نواب احمد بخش خان کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کی جگہ شمس الدین خان مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خان کو کلکتے پہنچ کر خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

میر فضل مولیٰ خان نام یارے داشتم، او را ناگرفت (ناگاہ) در عرض

راه به مرشد آباد یافتم. در نوردِ گفتگوہاے و پرس و جُوہاے کہ رفت، از جادہ گذاشتنِ (یعنی از مردن)، فخر الدولہ بہادر بن خیرداد، و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں بر گفتند. آوخ! کہ چراغ روشنِ ایں دُودمان مُرد، و شبستانِ آرزوہا تیرہ و تار شد. از جانبِ شما اندیشناکم و دانم کہ آنچہ شمارا پیش آید، دلخواہ نباشد. ناکساں را روزِ بازار خواہد بود، و فرومایگاں را گرمیِ ہنگامہ۔ زودا کہ انجمن از ہم پاشد، و پراگندہ چند گرد آیند۔ دولت روے گرداند، و آسودگی برخیزد۔ زنہار، ہوشمندی را کار باید بست، و ہموارہ بخود نگران باید بود۔

ایک اور خط کو جو علی بخش خان کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں،

جانِ برادر! سخن را از فراوانی بر رُوے ہم افتادن ست، و گرہ در گرہ گردیدن۔ و من آن میخواہم کہ اندک گویم، و سود بسیار دہد، و شنوندہ آں را زود دریابد۔ و ایں بسیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ نبشتن از گفتنِ آں مایہ دور تر نہ رود کہ سرِ ایں ہر دو رشتہ باہمدگر نتواں تافت، و نقشِ یکے در آئینہ دیگرے نتواں یافت. زمانے گوش بمن دارید و فرارسید کہ چہ میگویم و ازیں گفتن چہ میخواہم، و شمارا در برابرِ آں چہ می باید کرد و اندازۂ آں بایست تا کجاست" اس کے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرسِ مدرسۂ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں، اور انھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے، ان کے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں:

امروز شرارہ بداغم زدہ اند   نشتر بہ رگِ صبر و قرارم زدہ اند
از کثرتِ شورِ عطسہ مغزم ریش ست   تا عطر چہ فتنہ بر دماغم زدہ اند

جنبشِ خامۂ عیسوی ہنگامہ مطاعِ مکرّم مخدومِ اعظم را نازم کہ باحیاے ہوس ہاے مُردہ ساحتِ خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازارِ رستخیز گرم کرد۔ خار خارِ دیریں آرزو ہا سر از دل بدر آورد۔ بیاد آمد کہ مراہم در گیتی وطنے، واز مہربانان انجمنے بودہ است۔ چوں نشترِ پرسش بمغزِ اندیشہ فرو بردہ اند (یعنی احوال پرسیدہ اند)، خونچکانیِ نواہا تماشا کردنی ست۔ درازیِ زمانِ فراق کہ بگمانِ مخدوم شانزدہ سال است و بدانستِ نامہ نگار کم از بست سال نیست، سرتیز کرنکے

بودہ است کہ نقشِ آسایش از صفحۂ خاطر بداں ستردہ اند۔ آغازِ ورود بدہلی کہ دُردِ بادۂ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی بقیہ ہوا و ہوس در سر بود)، لختے از عمر بہ پیمودنِ جادۂ کامرانی ہوس گذشت، و بے راہہ خوابیدہ شد، تا سر از مستی بگردید (یعنی بد مستی سے بھر گیا)، و اندراں بیخودی پائے مصطبہ پیما بہ گوے فروفت (گڑھے میں اتر گیا یعنی ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم درہم شکستہ سراپائے و گرانِ اندوہ سر و دوشے، برخاستم۔ ہنگامۂ دیوانگی براوج یک طرف، و غوغائے وام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس را و لب، و نگاہ روزنۂ چشم، فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ با لبے از سخن دوختہ، و چشمے از خویش فروبستہ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی، با خود گرفتم، و از بیدادِ روزگار نالاں، و سینہ بردمِ تیغ مالاں، بکلکتہ رسیدم۔ فرماندہان سربندگی و کوچکدلی (یعنی مہربانی و شفقت) کردند، و دل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش کہ مشاہدہ رفت، امیدِ کشایش آورد، و ذوقِ آوارگی و ہوائے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود، بدل نماند۔ و ہوسِ آتشکدہ ہائے یزد و میخانہ ہائے شیراز کہ دل را بسوئے خود میکشید، و مرا بہ پارس میخواند، از ضمیر بدر جست (یعنی بمشاہدۂ شہرِ کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت)۔ دو سال دراں بقعہ مجاور بودم۔ چوں گورنر جنرل آہنگِ ہندوستان کرد، پیشاپیش دویدم، و بہ دہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، و کارِ ساختہ شدہ، صورتِ تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ، و دل بر مرگِ ناگاہ نہادہ، بکنجے نشستہ ام، و در آمیزش بروئے بیگانہ و آشنا بستہ۔"

"من اگر باایں ہمہ رنج و اندوہ کہ پارۂ ازاں باز گفتم، در نگارشِ نامہ و سپارشِ پیام کاہل قلم و کوتاہ دم باشم، و بزرگانِ وطن را بیاد نیارم، در عالمِ انصاف بزہ مند نیستم۔ اما اگر اسمانیگانِ جہانِ مہر و وفا کہ از دور افتادگان نپرسند و از مرگ و حیاتِ دوستاں باز نجویند، اگر گفتگو بمیان آید، و سمندِ شکوہ عناں بر عناں (یعنی بمقابلۂ یکدگر)، تازد گوئے دعویٰ چگونہ خواہند برد، و قطعِ نظر از حریفِ آب دنداں (یعنی حریفِ مغلوب) کہ منم، خدائے توانا را چہ جواب

خواہند داد:

کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست　　مرا در دہر، پنداری، وطن نیست“

مولوی نورالحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اس کے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

پدید آمد کہ خاطرِ عاطر را بجانب نثر گرایشے، و ہنگامۂ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ اید، و ہم اندریں فنِ گزیدہ روشے پیش گرفتہ اید۔ دم سردیِ شما (یعنی کم شوقیِ شما) بدانش آموزی آنچہ دیروز (یعنی در زمانۂ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام، یاد میکنم۔ و خون گرمیِ شما (یعنی سرگرمیِ شما) در خرد اندوزی آنچہ امروزی نگرم، خود را بدیں شادی کنم۔ ہمانا در اندیشہ نہالے برگزیدہ دارم، بداں زودی کہ ثمر از شاخ افتد، نخلے شدہ، و رُطب بار آوردہ۔ نے نے، بہ ہنگامۂ یوسفی در نظر دارم، بداں خوبی کہ دل از فرشتہ برباید، از بندِ حجاب بدر آمدہ، و ہر ہفت کردہ خواستہ آید کہ مسودۂ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں را نگریستہ و نشستِ ہر کرشمہ و انگیزِ ہر بند را بہ بایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحبِ من! مگر ندانستہ آید کہ گفتار جز بگفتار سرہ نگردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود۔ ہر چند ارادتِ شما ذریعۂ سعادتِ من، و خرسندیِ شما موجبِ رضامندیِ من ست، لیکن تحریر در میاں نگنجد، و بہ میانجی گریِ خامہ کار برنیاید۔ آرے، نگارش یکدست ست و گفتار لخت لخت۔ ستردنِ یک لفظ از میانہ و آوردنِ لفظِ دیگر بجاے آں برنشانۂ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس و جو دارد۔ و حقِ ایں پرسش نتواں گزارد، مگر بہم زبانی۔ دریں نزدیکی یکے از برادراں کہ در برادراں از وے عزیز ترے نیست، سخنہاے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثر ست، گرد آوردہ، و صورتِ سفینہ دادہ است۔ زیں پس آں مجموعۂ پریشانی را پیشِ شما می فرستم، تا دست مایۂ سگالش در سخن و باز نمایندۂ اندازۂ نکوئیِ فن تواند بود۔

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے (جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں ان کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف

کی ہے؛ اپنے نتائجِ افکار میں سے کچھ ان کو بھیجا ہے اور ان سے تازہ غزلیں جو حال میں لکھی ہوں، درخواست کی ہے۔ مرزا نے اس کے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے، اس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

"تا دکانم در کشادہ بود، و رنگ رنگ متاعِ سخن بر روے ہم نہادہ، کس از مشتریاں حلقہ بر دَر نزد، و سوداے خریداری از ہیچ دل سر بر نہ زد۔ چوں دکان را کالا، و زبان را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخونِ جگر) نماند روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفیٰ خان) پدید آورد کہ نقدِ رائجِ سخن خود را بہ بہاے گفتارِ ناسرۂ من می دہد و گوہر را بہ پلّۂ بیعانگیِ خزف می نہد .... ہاں وہاں، اے خریدارِ دکانِ بے رونق! از فراوانیِ مسرّتِ ورودِ مسعودِ ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا، با آنکہ نکوئی خواہِ خویشم، بر من بہ رشک آورد۔ حوصلۂ مرا کہ فرسودۂ غمہاے دہرم، گنجائیِ ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشۂ مرا کہ دل شکستۂ دور باشِ یارانم، فرجامِ پذیرائیِ ایں ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزارِ خویش چگونہ پشیمان گیرے کہ اینچنیں شادی را بخود در پذیرے، و دوستاں را تا کجا قدر ناشناس پندارے کہ از شما ایں قدر ستایش در بارۂ خویش باور دارے۔ حقّا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبانِ شیوہ بیاناں (یعنی فصحا)، و دشوارتر از آنست اندازہ نمائی باندازہ داناں۔"

"قبلہ مزدِ چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بر فرقِ فرزنداں سائے افشاندم (یعنی مجموعۂ نظم فارسی)۔ اکنوں آبم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست۔ گوئی پس از سفتنِ آں گنج گنجداں رُفتہ، و از سخن ہرچہ ازل آوردِ من بود، گفتہ شد۔"

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے تذکرۂ گلشنِ بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے۔ اس کو دیکھ کر مرزا صاحب نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے:

"من کہ زبانم در ستایش بیقرار است و اندیشہ در سگالشِ مشورہ گستاخ، امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نہ شوم۔ و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم۔ بنامیزد (چشم بد دور)، تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعۂ فراہم آمدہ کہ پیشِ طاقِ بلند نامی را نقش و نگار است و نہالِ نکو سرانجامی را برگ و بار۔

رہروِ نظر چوں بہ بیداے کنارِ ناپیداے ذوقِ سخن گام تماشا بردارد، توشہ بہ ازیں بہ کمر نتواند بست۔ خضر بآں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت، لبش بر شحۂ آبے تر نتوانست کرد و آں آب از دریا بخشیدن بود۔ شاگردے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانیِ جاوید بخشید، و ایں لختے از عمر بکارِ دیگراں کردن ست۔ جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ و ہمگناں را بہ نکوئی نام برآمد۔ بارے گہر سُفتنِ خامہ و گوہریں نگشتنِ نامہ در ردیفِ الف بہ نگارشِ اشعارِ پرویں نثار حضرتِ آزردہ از چہ رُوست؟ ہرچند ذکرِ خدام بہ چنیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوارِ شانِ فضیلت باشد، لیکن اگر بمقتضاے فرطِ محبت جرأتے بکار می رفت، گناہے نبود و در تلافیِ آں بہ پوزشِ[۲] نیاز نمی افتاد۔"

حکیم احسن اللہ خان مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں، خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

"دردمند نواز! نسیمِ وُرودِ مشکیں رقم نامہ غنچۂ ایں راز را پردہ کشاے و شمیمِ ایں نوید را غالیہ ساے آمد کہ روزگار بہ گزلکِ مدِ طولِ زمانِ فراق نقشِ بے اعتباری ہاے من از صفحۂ خاطرِ احباب نہ ستردہ، و ترکتازِ صرصرِ بیدادِ جدائی خاکساری ہاے مرا از یادِ عزیزاں نبردہ است۔

"در معرضِ طلبِ نثر فروماندہ تر ازاں میزبانِ بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک) مہمانے عزیزش از راہِ دور در رسد، و بیچارہ لباگیرِ سراپاے سرمایۂ خویشتن نگردد۔ ناشورباے دُود پختے و نانِ کشکینے (یعنی نانِ جویں) فراز آرد۔ من و ایمان بین کہ نگرد آوردنِ نثرِ پراگندہ نپرداختہ و خود را دریں کشاکش نیند اختہ ام۔ چہ پیداست کہ فرو ریختۂ کلکِ ایں کس (یعنی من)، نقشے ست نژند (یعنی زشت)، یا رقمی ست فرہمند (یعنی خوب)۔ در صورتِ اوّل چہ لازم ست، خود را بہ ہیچ فروختن و وبالِ نظارۂ آیندگان بسلم خریدن، و در شقِّ ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگان چہ بُردہ اند و گذشتگان

چہ یافتہ کہ مارا از رُوے آں دایہ (یعنی وزلوزہ) بتیاب دارد۔ انصاف بالاے طاعت ست۔ بدعویٰ گاہے کہ توانائیِ قتیل را بغزدہیدگیِ فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگیِ روش) مسلّم داشتہ و لواے نور العین واقف بشیوائیِ شیوۂ (یعنی بخوبیِ طرز) برافراشتہ باشند باکہ باید گفت کہ نتائجِ طبعِ ما کجائی است و مارا چہ لذت دریں جگر خائی ست۔ سطرے چند بیابجگیِ دیوانِ ریختہ کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و دودِ سوداے کہ بہ آرایشِ سفینۂ موسوم بہ گلِ رعنا از سویدا جوشیدہ است، ارمغان فرستم و از شرمِ تنگ مایگی آب میگردم۔ والسلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے، اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں:

دریں ہنگام کہ فرو ماندگی از اندازہ گذشتہ و دل بہ افسردگی خوی گرفتہ است، ندانم چہ می نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگریستن نگہ از ناز بدیدہ درنمی گنجد، و دریں نگارش خامہ از شادی در بُنان (سرانگشت) می رقصد۔ بخت را بہ رسائی ستائیم و پندارم کہ بطُورِ معنی رسیدہ ام۔ خود را بگراں مایگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را با یدِ بیضا دیدہ ام۔ اگر مخدوم مرا بگرفتنِ عیارِ ایں دعویٰ جبرتے روے دہد، و ایں مایہ بالا خوانی و خودستائی از من عجب آید، گویم، ہاں انصاف، سخن بکنایہ می سرایم نہ بگزاف۔ موسیٰ اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسیٰ جان ست؛ و یدِ بیضا عبارت از دیوان فروغانی عنوان۔

”نہے دیوان کہ مدادش از دودۂ چراغِ طُورست، و غلافش از دیباے حُلّۂ حور۔ قلزمِ معنی را سفینہ است، و جواہرِ مضمون را گنجینہ۔ . . . . سبحان اللہ سخن بہ روزگارِ مخدوم بہ پایۂ بلند رسید، و اردو را رونقِ دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدنِ نامۂ من بخاطرِ عاطر جاے گرفت، و شکوۂ آں بہ زبانِ قلم رفت، مرا آبرو افزود۔ وازش مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ خوشا من کہ دراں چشم و دلم جاے باشد، و چوں نامۂ من نہ رسد بآرزو ارزد۔ گردِ سرِ ایں نوازش گردم و بریں پرسشِ جاں برافشانم . . . .“

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعۂ خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے، اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں:

"قبلہ و کعبہ! اگر ایں نہ بودے کہ لالہ ہیرالال را ہوائے دیدنِ عنقا در سر، و ناگاہ شامگاہے بہ نشیمنِ تنہائیِ من گذر افتادے، آں در گرفتنِ آتش گرداگردِ والا کاشانہ و سوختنِ خانہ و رختِ ہمسایگاں از ہر کرانہ، و نہ رسیدنِ آسیبے بملازمان در آں میانہ، از کجا شنودمے؟ و اگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حقِ دوستانہ پرسش کہ شیوۂ غم خواری و اندوہ ربائی است، ناگزاردہ ماندے۔ و ہم ایزدی نیایش کہ لازمۂ حق شناسی و سپاسگزاری است، بتقدیم نرسیدے۔ ہاں! اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرالال) کامیاب بہ پیام و نامہ، و آشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ:

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید
نامۂ واشدہ، مہر بہ عنواں زدہ

"ہمانا آں سوزندۂ آذر سرگرمیِ شوق از من فرا گرفتہ بود کہ بیتابانہ گردِ سر گردید، و اندراں اشتلم (شدت) زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت۔ ہیہات! من کجا و ایں ہمہ دعویِ بلند از کجا! خودنمائیائے گمانِ تاثیرِ مہر و وفاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لائے دیانہ سرائے دارد، ورنہ آنرا کہ از شعلۂ آہِ جگر سوختگاں دامن نہ سوزد، عجب نیست اگر آتشِ افروختہ پیراہن نہ سوزد۔ شکوہ پیشکش، و پیغارہ (طعنہ) بر طرف، خدائے توانا را شکر گویم کہ بلائے بے زینہار از بندگانِ خویش بگرداند، و تا بے بصراں را دیدہ و دیدہ وراں را سرمہ بدست افتد۔ کرشمۂ نیروئے جبریلؑ و معجزۂ آسودگیِ خلیلؑ را در نظرہا تازہ کرد...... اگر دانستمے کہ پیشِ خود شرمساری نخواہم کشید، و مرا اندریں محال طلبی بر من زبانِ طعنہ دراز نخواہد شد، ازاں مخدومِ بے عنایت پاسخِ ایں نامہ و تفصیلِ ایں ہنگامہ در خواستمے و پرسیدمے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، و نگہ بسراغِ تیرگیِ دودے و تابشِ نمودے فرا رسید، شما چہ می کردید؟ و نورِ چشمِ مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ و پس از آنکہ رستخیز در ہمسایہ آشکار شد، و ہزاہز در انجمن

افتاد، سراسیمگیِ درونیِ پرستاراں و بیتابیِ برونیِ ہواداراں چہ قیامت آورد؟ وایں ہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟ و فرجام کار کہ مژدۂ ایمنی دادند، بر کارخانۂ دواب و بنہ و بارِ کہاراں (یعنی اسبابِ ایشاں) کہ اینہا را جز بہ اطرافِ کاشانہ محل نیست، و بیشترِ ازینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزندۂ (ایندھن) آتش ست، چہ گذشت؟ لیکن چوں ارزشِ التفات از من سلب کردہ، و مرا اینک در دل فرود آوردہ اند کہ حالیاں درآں گوشۂ خاطرم جاے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریقِ آرزوست نہ بہ سبیلِ سوال۔ والسّلام۔"

نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوقِ ملاقات اور غزلِ تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے، اس کے اوّل اور آخر کے فقرے یہ ہیں:

"سحرگاہے کہ دلم از دردِ شانہ چنانکہ مومنؔ ہمیشہ از رنجِ ہمسایہ در آزار باشد، بیقرار بود، و دستم از اشتلمِ بیتابیِ دل رعشہ دار؛ فرخندہ سروشے از در درآمد، و سپردنِ بہارسامان نامۂ گل بہ جیبِ تمنا ریخت۔ ہرچند نامہ سپار مسِ امید را کیمیا، و دیدۂ جاں را توتیا آورد، تارکِ اقبال را افسر، و پیکرِ آرزو را زیور بخشید، لیکن از آنجا کہ آں قدسی مفاوضہ از شعر و غزل، چوں نامۂ اعمالِ زاہد از ذکرِ مے و شاہد سادہ بود، دلِ سودازدہ بدل نیاسود، و خمارم بداں یکدو جرعۂ صہبا نشکست۔ گفتم ہے ہے، نہ مژدۂ دیدارے کہ دل بہ نشاطِ آں تواں بستن، و نہ کرشمۂ غزلے کہ لب بہ زمزمۂ آں تواں کشودن۔۔۔۔

امید کہ ازیں بعد زود نہ دیر، بانشای غزل شادم فرمایند، و نویدِ رُو بکوتاہی نہادنِ روزِ فراق کہ اندریں موسم کہ خسروِ انجم بہ اسدؔ جاے وارد و عجب نیست بفرستند دولت و اقبال روزافزوں باد۔"

جوابِ نامۂ شیخ امیر اللہ سرورؔ تخلص:

"رسیدنِ دلنواز نامہ دل را تنومند و شاخِ آرزو را برومند ساخت۔ گلہ از نارسیدنِ پاسخِ نامہ ہاے خویش می کنید و از خدا شرم ندارید۔ من خود از جانبِ شما نگرانی داشتم کہ کجائید؟ و چہ در سر دارید؟ بارے پردہ از روے کارِ شما برگرفتم، و دانستم کہ یک چند مرا فراموش کردہ بودید

ناگاہ ورودِ جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ افتاد۔ شنیدید کہ فلانی (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زندہ است، مہرِ کہن بجنبید؛ خواستید کہ بہ بار یاد آورید۔ از فراموشیِ روزگارِ گذشتہ اندیشہ کردید، لاجرم دروغے چند برہم بافتید و آں را دیباے دیباچۂ نامہ ساختید۔ از حالِ من پرسیدہ اید۔ چہ گویم کہ بگفتن نیرزد۔ چنانکہ گفتہ اند:

شکستہ دل تر ازاں ساغرِ بلورینم
کہ در میانۂ خارکسی زدور رہا

خیرہ سرو آشفتہ راے، نہ زبانِ سخن سراے، و نہ دل از سراسیمگی برجاے۔ چہار سال می گزرد کہ مقدمۂ من با جلاسِ کونسل در پیش ست، و دلم از تفرقۂ بیم و امید ریش۔ حکمے کہ قطعِ خصومت تواند کرد، بر نیامدہ، و ہنگام بہ پایاں رسیدنِ تیرہ شبِ ناامیدی در نیامدہ۔ حالیا بر آں سرم کہ چوں جزوِ اعظمِ کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنک بہادر بدیں دیار در آید، بدامنش در آویزم و داد خواہم، و استدعاے صدورِ حکمِ اخیر کنم۔ گروہے بر آنند کہ نوابِ عالی جناب بہ دہلی نخواہد آمد، و ہم ازاں رہگذر ہا بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنین ست بدا! من و روزگارِ من، و آوخ از دوریِ راہ و درازیِ کارِ من۔

”خواستہ آید کہ نتائجِ طبعِ والاے شما بنگرم و از نزادیدہ ہاے کام و زبانِ خود بشما ارمغانی فرستم۔ فرصتِ آں کجا؟ و دماغِ ایں کو؟ آمد آمدِ نواب گورنر، و دریوزۂ اخبار از ہر در، ترتیبِ افرادِ مقدمہ، و تمہیدِ نگارشِ حال، سنجیدنِ اندیشہ ہاے رنگا رنگ، و سگالیدنِ اندازۂ بیان، آں مایہ دستیاری و غمخواری از کسے چشم نہ دارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم، نقلِ آں تواند برداشت، یا چوں دفترے از بہرِ نگریستن پریشاں کنم، آں اوراقِ پراگندہ را فراہم تواند کرد۔ بہر رنگ چند روز دگر معاف دارید و تا زمانیکہ بمن پیوندید، گاہ گاہ بہ نامہ زنگ زداے آئینۂ وداد باشید۔“

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں، ان کو نواب امین الدین خان مرحوم کے باب میں جب کہ وہ رئیسِ فیروز پور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمہ

کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں، اس طرح لکھتے ہیں:

"مخدومِ غالب! اگر نہ اندوہِ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے، من دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردے صرفۂ شما (یعنی سودِ شما) در ناکامیِ من ست (جس کے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے)، ورنہ اگر تاب و تواں داشتمے، آں قدر با شما در آویختمے کہ شما را دامن و گریبان بہ زیاں رفتے، و مرا سر ورد شکستے. آخر از خدا بترسید و از روے داد بسنجید کہ کارِ من و شما بداں رسد کہ روزہا بگذرد و بہ نامہ یاد نکردم. گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بندِ گزارش اندوہِ تازہ ام شکوہ کجا بخاطرِ ناشادی رسد. اگرچہ اندریں ورق گنجائیِ ایں دو سطر نیز نبود، لیکن اندیشہ بداں پیچید کہ مبادا دوستِ ادا نشناسِ من مرا از خود خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدۂ جاویدِ گسستہ امید باشم

"بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ را ہماں موجِ بلا کہ زورقم شکستہ بود (یعنی تعدّیِ رئیسِ فیروز پور) خانہ بسیلاب فنا داد. خونِ دخانیم بگردن کہ دریں سفر از ہمپائیش باز ماندم. واماندگی و بیچارگیِ من از ینجا تواں سنجید کہ دندان بر جگر نہم، و امین الدین احمد خان را در سفر تنہا گذارم. اگر قاضیِ محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند، و بہ تیغ بدریغ خونم ریزد، سزاوارم و تلطف دریں ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار گرایم، و ہنگامۂ پوزش آرایم، شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید. مگر سراج الدین احمد بہ تلافی برخیزد، تا از گرانیِ تشویر (شرمندگی) سبکدوش گردم، و گردِ خجلت از چہرہ برافشانم، یعنی کمر بہ غمخواری و رہرو نوازی استوار بندید، و خود را دوستِ دیرینۂ امین الدین خان دانستہ آں چناں چارہ سازی و سگالش گری بجا آرید کہ ایں دردمندِ دور از خانماں (یعنی امین الدین خان) اسد اللہ رو سیاہ را فراموش کند، و شما را بجای او داند. و نیز بہ برادرِ والا قدر گفتہ شدہ

است کہ چوں بکلکتہ رسد و شمارا دریابد، داند کہ اسداللہ پیش ازو بہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر ازیں مدارج کہ برشمردم، آخر خدائے ہست و دادے ہست! افسانۂ ناکامی و ستم کشیِ ایں فروغِ ناصیۂ سعادت یعنی امین الدین احمد خان خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند۔"

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں:

"گوہر آگیں نامۂ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید و دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید۔ نارسیدنِ نامۂ مرا بافسردگیِ شوقم حمل کردید، چرا برگِ من حمل نہ کردید، تا از اداشناسی ہاے شما خرسند بودمے و شمارا اہلِ دل و دانشور شمردمے۔ من و ایمانِ من کہ ریشۂ مہرِ شما بمغزِ دل و دیدہ و محبتِ شما با جان درآمیختہ۔ تا زندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئینِ من ست، و مودتِ دینِ من ست۔ اگر در نگارشِ نامہ درنگے روے دہد، بر فراموشی محمول نہ شود۔ دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سوداہا در سر۔ چہ گویم چہ می کنم، و روز و شب چگونہ بسر می برم"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرلنگ صاحب فارن سکریٹری گورنمنٹ کی کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں:

"عمرِ من و جانِ من! پس از رسیدنِ گرامی نامہ دربندِ آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماجراے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ دوشنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود، آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارمِ اخلاق را شیرازۂ وجود از ہم گسیخت؛ شمعِ ایوانِ سروری مُرد، و نہالِ باغِ آگہی را برگ و بار فرو ریخت، دستگیرِ درماندگاں را دست از کار رفت، و گرہ کشاے بستہ کاراں را ناخن شکست۔ خاکم بدہن، چگونہ گویم؟ واگر من نگویم کیست کہ نمیداند کہ مسٹر اندور استرلنگ مُرد، و از گیتی جُز نام نیک با خود نبرد۔ کاش، روے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بروزنۂ گوشم ریختندے، تا نہ شنودمے کہ چہ شد۔ اکنوں امیدِ غمخواری از کہ بایدم داشت، و دل را بخیالِ گردشِ چشمِ کہ تسکین داد۔ رپوٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر خصوصِ دادخواہیِ من بہ صدر فرستادہ است چہ گویم کہ چہ امیدکاہ و اندوہ فزاے بودہ است۔ بر کارسازی آں

چابک خرام بیداے فنا (یعنی اسٹرلنگ) داشتم۔ اکنوں از شش سُو فلک بکامِ دشمن ست۔ زینہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ رُوے داد و آں گلبنِ روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، و پس از وَے سرانجامِ دفترکدہ چہ شد و جانشیں کہ گرفت۔ اللہ بس ماسوٰی ہوس۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں:

"والا نامہ رسید، و نویدِ فراقِ دائمیِ مرزا احمد رسانید۔ چہ مایہ سنگیں دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیتِ دوست انشا می کنم، و اجزاے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموشِ بیمروت راہ گرداند، و ناقہ بسر منزلِ دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطرِ دوستاں عزیز نداشت؛ چرا بحالِ خردسالانِ خود نپرداخت و سایہ از سرِ شاں باز گرفت۔ ولے بے یاریِ یارانِ وَے، و دریغا بے پدریِ پسرانِ وَے۔ ہر چند از مرگ نتواں نالید، و گسستنِ تار و پودِ [illegible] را چارہ نتواں کرد، لیکن انصاف بالاے طاعت است، ہنوز ہنگامِ مردنِ مرزا احمد نہ بود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے، و رُوے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدمے! چرا آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، و کارہا بہ اندازۂ دانشِ وَے رواں گشتے! حیف کہ ہمیں پسرِ خُردسال ست و باشد کہ بہ حقیقتِ سرمایۂ پدر دانا؟ و گرد آوردنِ زرہاے پراگندہ توانا نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد، بباد دہد، و بر فرودستانِ خود ستم کند و کہیں برادراں را ناکام گزارد۔ ہر آئینہ دریں حال امینے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرد چارہ برآید و غمخواریِ بے پدر ماندگاں نماید۔ للہ درّ مَن قال:

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر
کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمارِ آں بیچارگاں عینِ فرض و فرضِ عین ست ہم بر شما و ہم بر مرزا ابو القاسم خان۔ بیکسیِ ایں جماعہ در نظر باید داشت، و غافل نباید بود۔ اِنّ اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔"

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں:

”زینہار، صد زینہار، اے مولوی سراج الدین! بترس از خدائے جہان آفریں کہ چوں قیامت قائم گردد، و آفریدگار بنشیند، من گریان ڈمویہ کنان دراں ہنگام آیم، و در تو آویزم، و گویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت و دلم برد، و چوں من از سادگی بر وفا تکیہ کردم، و ایں را از دوستاں برگزیدم، نقش کج باخت و بمن بیوفائی کرد۔ خدارا بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ ولے برمن کہ روزگارہا گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداشِ وفاست، بسم اللہ ہر قدر توانی، بیفزائے کہ ایں جا مہر و وفا فراواں ست، لاجرم جفا نیز، باید کہ فراواں باشد و اگر خود ایں تغافل بہ بار افزاہِ (یعنی بپاداشِ) جرمے دیگر ست، نخست گناہ را خاطر نشاں باید کرد، وانگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ درمیاں نگنجد و مرا زہرۂ گفتار نباشد۔ منم کہ معاشِ من از گونہ گوں رنج و رنگ رنگ عذاب بمعادِ کفار ماند، خون در جگر و آتش در دل و خار در پیراہن و خاک بر سر۔ ہیچ کافر بدیں روزگار گرفتار مباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روے مانم کہ در صحرا پایش بگل فرو رود، و ہرچند خواہد کہ بالا جہد، نتواند و فرودتر رود۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خان بہادر کہ گیتی لا برّویش دیدمے، و وصالش را زندگی دانستمے، بکلکتہ رہگرا شد۔ دیگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بدیدارِ کہ شادماں دارم۔ واماندگیِ من ازینجا تواں سنجید کہ نتوانستم بہمپائیش کردن و روا داشتم، او را تنہا گزاشتن۔“

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمے کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

”کارِ من بدادگاہِ دہلی، چنانکہ دانستہ باشید، تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ امان دہد، بازبداں در (یعنی دِ سپریم گورنمنٹ) رسم و دردِ دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را برخود بگریانم ہیہات!

اگر معاشِ من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ، ہم بدیں توثیق، از رُوے دفترِ سرکار ثابت شدہ بود۔ بایستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش رانندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش، آنچہ تو باز یافت وانمودہٗ، یافتنی ازاں افزوں تر نیست، و قرار داد نیز ہماں ست۔ لاجرم، دیوانہ بودے، اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک قبیلہ (یعنی باجمعے کثیر) کہ خویشان و برادرانِ من اند، بہ ستیزہ برخاستے و بہ باطل ستیزی نام برآوردے ....

"چہ کنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت۔ خدارا بنگر، و بہ دردِ دلِ من دارس۔ کولبرک بتوسطِ کرنیل ہنری املاک بر من مہربان شود و رپوٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید، بصدر فرستد، و جوابے کہ سودمند تر ازاں نتواں سنجید، از صدر حاصل نماید۔ ہنوز آں جواب در راہ باشد کہ کولبرک معزول گردد۔ و ہاکنس کہ بجاے کولبرک نشیند، آنچہ برہم زدنِ ہنگامۂ سلطنتے را بس باشد، از بہرِ من بصدر نویسد، و من دراں داوری (معاملہ) از مسٹر اسٹرلنگ چشمِ یاوری داشتہ باشم۔ ہنوز آں رپورٹ بصدر نرسیدہ باشد کہ مسٹر اسٹرلنگ رہروِ راہِ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ بگسلم و بدامنِ جارج سوئنٹن بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغلِ جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ! معزول نگردد، مگر کولبرک، بمرگِ ناگاہ نمیرد، مگر اسٹرلنگ؛ بولایت نہ رود، مگر جارج سوئنٹن؛ و خود ایں صدمہ ہاے جانکاہ نباشد، مگر اسد اللہ دادخواہ۔۔۔۔"

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط:

"دلنواز نامہ پس از عمرے رسید، و عمرے دیگر بخشید تا عمرِ باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد۔ امّا شاد کردنِ دلے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشد، نہ آساں ست۔ بینم کہ چوں نامۂ شما رسیدے، مستانہ از جاے برجستمے، و جہاں جہاں نشاط اندوختمے، اینک تا چشم بہ سوادِ ایں صحیفہ دوچار شد، گیتی در نظرم تیرہ و تار شد۔ نخست آنچہ بنظر در آمد، خبرِ آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خون کرد۔ یعنی از جہاں رفتنِ خواہرِ عزیزِ شمائےہے اخندمۂ مرحومہ ہماں ست کہ تا در کلکتہ خبرِ رنجوریِ وَے شنودہ بودید، دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپاے خاطر را فرو گرفتہ۔ در نظر دارم کہ از مردمش

بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد۔ توانا ایزدِ پاک شما را شکیب عطا فرماید، و تومندیٔ دل و توفیقِ ثبات ارزانی دارد، و ایں سانحہ را در روزنامۂ عمرِ شما خاتمۂ مکارہ و مقطعِ مصائب گرداند۔

"آشکارا شد کہ مخدوم! مرا از علاقۂ تازہ خوشنودی نیست۔ ہر آئینہ انکشافِ ایں معنی غبارِ ملال بر دل فرو ریخت۔ خدارا دل تنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت۔ شارستانے (معمورۂ) بدیں تازگی در گیتی کجاست؟ خاک نشینیِ آں دیار از اورنگ آرائیِ مرز و بومِ دیگر خوشتر۔ من و خدا کہ اگر متاہل نہ بودمے، و طوقِ ناموسِ عیال بگردن نداشتمے، دامن بر ہر چہ ہست، افشاندمے، و خود را دراں بقعہ رساندمے۔ تا زیستمے، دراں مینو کدہ بودمے، و از رنجِ ہواہای ناخوش آسودمے۔ زہے ہواہاے سرد و خوشا آبہاے گوارا، فرخا بادہ ہاے ناب و خرما ثمرہاے پیش رس:

ہم گر میوۂ فردوس بخوانت باشد   غالب! آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد"

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیرِ خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستایش کے ساتھ اخبار آئینۂ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا ہے، تو اس کا شکریہ اور ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے:

"گمنامے را نامور ساختن، و ہیچے را ہمہ پنداشتن، عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ، خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرامِ داعی روے نماید، و آں بزرگ مرحمتے بے استدعاے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بین دارد، بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہ، اجزاے ممکنہ را کہ در کتمِ عدم متواری بودہ اند، بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، و بران معدومات منت نہادہ۔ حقا اگر تاملے بسزا کردہ شود، رقم گشتنِ قطعۂ تاریخ در آئینۂ سکندر ازیں عالم خبری دہد۔ و چوں ناخواستہ اینچنیں نوازش بمیان آمد، ہر آئینہ روائیِ خواہش را چگونہ چشم نتواں داشت؛ لاجرم در گزارشِ مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سرانجامِ گفتگو دادہ می شود۔

"نہفتہ مباد کہ قدر شناسیِ حکام رنگِ آں ریخت کہ فاضلِ بے نظیر و المعیِ یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داریِ عدالتِ دہلی استعفا کردہ، خود را از ننگ و عار وا رہاند۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم و فضل و دانش و کنشِ مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد، یک وا ماندہ، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داریِ عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہدہ دونِ مرتبۂ وے خواہد بود۔ بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خان رئیسِ جھجر، پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارفِ خدامِ مخدومی معین کرد و نزدِ خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت، ولیعہدِ خسروِ دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را تا پدرود کنند، سُوئے خود طلبید، و دو شالہ ملبوسِ خاص بدوشِ وے نہاد، و آب در دیدہ گرداند، و فرمود کہ "ہرگاہ شما می گوید کہ من رخصت می شوم، مرا جز اینکہ بپذیرم، گریز نیست۔ امّا ایزدِ دانا داند کہ لفظِ وداع بہ زبان نمی رسد الّا بصد جرِ ثقیل" تا اینجا سخنِ ولیعہد بہادر ست۔ غالبِ مستہام از شما می خواہد کہ واقعۂ تودیعِ مولوی فضل حق، و اندوہ ناکیِ ولیعہد بہادر، و بہ درد آمدنِ دلہائے اہلِ شہر، بعبارتے روشن و بیانے دلآویز در آئینۂ سکندر بقالبِ طبع درآرید و مرا دریں تفقد منت پذیر انگارید و السّلام۔"

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں، جس سے ان کے مفصل حالات معلوم ہوں؛ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

"ہر نسیمے کہ ز کوئے تو بخاکم گذرد
یادم از دولۂ عمرِ سبکتاز دہد

رسیدن مہر افزا نامہ دل برُد، و جاں بخشید۔ اگر چہ آں جان با من نماند، و ہم بر سرِ آں نامہ بہ فشاندن رفت۔ لیکن سپاسِ دلربائی و جاں بخشی باقی ست امید کہ تا جانِ بخشیدۂ یزداں در تن ست، گزاردہ آید۔

"مخدومِ من در رسیدنِ نامۂ پیشیں دو دل (متردد) چراست؟ ہنوزم نشاطِ ورودِ آں نمیقہ در دل، و سوادِ سطورِ آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں

فرماں چناں بود (یعنی دہ نامۂ پیشیں)، کہ غالبِ خویشتن نشناس لختے از رسم و راہِ سترگانِ پارس برگوید، وکتابے ازاں گروہ نشان دہد کہ رازِ آں دیرین کیش و سازِ ایں باستانی زبان، ازاں اوراق تواں یافت۔ لاجرم دانشِ من (علمِ من)، اندازۂ سرانجامِ پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد)، چوں دوبارہ گفتند کہ خواہش چنین ست، ناچار مہرِ خموشی از دہان و پردۂ شرمِ نادانی ازمیاں برداشتہ، میگویم کہ روائیِ ایں خواہش از ہیچ کس چشم تواں داشت، وخود را بہ بندِ ایں پژوہش (تلاش) خستہ نتواں کرد۔ نگارندۂ دبستانِ مذاہب باایںہمہ لافِ آشناروئی (واقفیت) آنچہ می گوید، نہ ہمہ است نہ ہمہ برجائے خود ست (یعنی نہ مکمل ست و نہ سراپا صحیح ست) پارسیاں در سورت و بمبئی آشیاں دارند، زینہار گماں نبری کہ ازاں گروہ (یعنی از سترگانِ پارس)، جز نام، نشان دارند۔ آں پویہ و آں ہنجار (یعنی آں روش و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمہ و نژاد از روئے شیوہ بپارسیاں نمانند۔ پارسیاں از گرانمایگانِ روزگار و برگزیدگانِ دادار بودہ اند، و بہ روزگارِ فرماں روائیِ خویش دانشہائے سودمند (علومِ مفیدہ)، و کنشہائے خرد پسند (اخلاقِ پسندیدہ) داشتند کشایشِ رازِ خرامشِ ہفت سپہر، و نمایشِ اندازۂ گردشِ ماہ و مہر، پدید آوردنِ رخشندہ گہرہا از تہِ خاک، و بدر کشیدنِ بادۂ ناب از رگِ تاک، پژوہشِ اسبابِ خستگی و رنجوری، و گزارشِ احکامِ پزشکی (طبابت) و چارہ گری، پردہ کشائیِ فہرستِ اسرارِ کیائی (سلطنت) و فرماندہی، و رصدبندی، تقویمِ آثارِ بندگی و فرمانبری، عنوانِ بیک دگر بستنِ رنگ رنگ گہرہا، و ہنجارِ سرہ کردنِ گونہ گوں ہنرہا، داروگیاہا فراخورِ ہر دردِ بکار اندر آوردن، و پرندگانِ ہوا و درندگانِ دشت را بہ شکار اندر آوردن، کوتاہی سخن، والائیِ اندازِ ہرگونہ بینش، و پیدائیِ اندازۂ کمالِ آفرینش، ہمہ در آئینۂ اندیشۂ ایں فرزانگاں روئے نمودہ۔ و انگیزشِ بایستگیِ گفتار و کردار کہ اکنوں بہ اندکے ازاں بسیار نازند، از مغزِ دانشِ ایں فرہنگیاں بودہ است۔ گنجینۂ خسروانِ پارس را از ہر علم دفترے بود و ہر دفتر از گرانمایگی گنجِ گوہرے۔ چوں دولت ازاں طائفہ روئے برتافت و سکندر ابن فیلقوس

برایران دست یافت، کتبِ خاصۂ خسروی بتاراج رفت۔ امّا آنچہ پراگندہ بود وگناماں بہرگوشہ وکنار داشتند، برجا ماند، تا بہ روزگارِ پیروزیِ تازیاں دراں کشش وکوشش از ہرجا گرد آمد (فراہم آمد)، وبرفرمانِ خلیفہ افروزینۂ گلخنِ گرمابہاے (حمام ہاے) بغداد شد۔ ہمانا احکامِ آذرپرستی ہم بہ آذر بازگشت۔ زبان آورانِ عرب پارسی را بتازی آمیختند، وزبانے تازہ برانگیختند۔ اکنوں کیست تا بداں زبانِ کہن سخن درست تواند گفت، وازاں دیریں آیین براستی خبر تواند داد۔ پژوہندۂ ایں راز را کامِ دل برنیاید، ومن ضامن کہ ہرچہ پس از فراواں جستجو فراہم آرد، نہ آنچناں باشد کہ دل بداں تواں نہاد۔

"دیگر آنچہ کلکِ مشکبار بداں رفتہ کہ منتخبے از گفتارِ ناروائے خود برنگارم وتلخے از ماجراے خو برگزارم، اندیشہ را بہ لب گزیدن وخرد را بشگفت زار (در محلِ تعجب) افکند:

چگویم از دل وجانے کہ در بساطِ من ست   ستم رسیدہ یکے، ناامیدوار یکے

بزرگانِ من از آنجا کہ با سلجوقیاں پیوندِ ہم گوہری داشتند، وبعہدِ دولتِ ایناں رایتِ سروری وسپہبدی افراشتند۔ بعدِ سپری شدنِ روزگارِ جاہ مندیِ آں گروہ (یعنی سلجوقیاں)، چو ناروائی (کساد بازاری) وبینوائی رُوے آورد، جمعے را ذوقِ رہزنی وغارتگری از جاے بُرد، وطائفہ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاگان مرا بہ توران زمین، شہرِ سمرقند آرامشگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگِ ہند کرد، وبہ لاہور ہمراہِ معین الملک گزید چوں بساطِ دولتِ معین الملک در نوشتند، بدہلی آمد، وبا ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہادر پیوست۔ زاں پس پدرم عبداللہ بیگ خان بشاہجہان آباد بوجود آمد، ومن بہ اکبرآباد۔ چوں پنج سال از عمرِ من گذشت، پدر از سَرم سایہ برگرفت۔ عمِ من نصراللہ بیگ خان چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد، ناگاہ مرگش فراز آمد۔ کمابیش پنج سال پس از گذشتنِ برادر پے مہین برادر برداشت، ومرا دریں خرابہ جا تنہا گذاشت۔ وایں حادثہ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی وگردوں را کمینہ بازی بود در سالِ ہزار وہشت صد وشش عیسوی بہنگام

ہنگامۂ لشکر آرائی و کشور کشائیِ صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر بروئے کار آمد۔ چوں عمِ مرحوم از دولتیانِ دولتِ اہلِ فرنگ، و با انبوہی چار صد سوار برکابِ صمصام الدولہ، با سرکشاں سرگرمِ جنگ بود، و ہم از بخشش ہائے سرکارِ انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافاتِ اکبر آباد، بہ جاگیر داشت۔ سپہ سالارِ سرکارِ انگلشیہ بہ خونبہائے آفتاب (یعنی نصر اللہ بیگ خان)، کلبۂ تارِ گدایاں را چراغ و ما بینوایاں را بعوضِ جاگیر، بمشاہرۂ از خار خارِ جستجوئے وجہِ معاش فراغ بخشید۔ تا امروز کہ شمارۂ نفس شماریِ زندگانی بہ چہل و چار میرسد، بداں راتبہ خرسندم، و بداں مایہ قانع۔

در سخن از پرورش یافتگانِ مبدأ فیاضم، و سوادِ معنی را بفروغِ گوہرِ خویش روشن کردہ ام۔ از ہیچ آفریدہ حق آموزگاریم بگردن و بارِ منتِ رہنمائیم بر دوش نیست۔

غالب بگہر ز دودۂ زادشمم — زاں روبصفائی دمِ تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی، زدم چنگ بشعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

نامہ بہ پایاں رسید، و شرمِ پراگندہ گوئی و درازنفسی برمن اشتلم کرد۔ دیدہ ور داند کہ گفتنی فراواں بود، و افسانہ پریشاں؛ تا کجا اندک گفتمے، و گفتار را از درازی نگاہداشتمے۔ مراد در آنچہ رفت، گناہے نیست۔ و اگر خود گناہ ست، دوست کریم ست و کرم عذر خواہ۔ والسّلام۔

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رائے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جب کہ وہ کلکتے میں ہیں، ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے، لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اس کی جبلّت میں ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

"ایکہ گفتی، فلانے روشِ حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آگاہانہ می گزارد، با ایں ہمہ اندوہناکی خندہ ام در گرفت، و عنانِ ضبطِ خویش از کفم بدر رفت۔ ندانی کہ بر اسپانِ بادرفتار برنشستن و گروہا گروہ مردم را پیشاپوش دوانیدن، تن را بلباسِ رنگا رنگ برآراستن، و معدہ را بہ الوانِ خوردنیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیروں راندن، و غبارِ معصیت

بر فرق افشاندن، از حکما نیاید، و پزشکان را نشاید۔ کارِ دانشوراں چیست؟ دور از آبادی در بُنِ کوہے نشستن، و از شش جہت در بروے خلائق بستن، تن را بہ ریاضت فرسودن، و جاں را بخردی پالودن۔ ہر کہ حکیم خردگزیں ست، کار و بارش این ست۔ بے برگ و نواے از شکنجۂ گوناگوں حسرت بدر جستہ بہ فراخ ناے سرخوشی رستی، رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رَو و بالطبع کریم بود۔ ہنوز ادعیۂ منی از ریاحِ غلیظۂ صالحۂ کبدیہ ممتلی دارد؛ ہر آئینہ بفرمانِ باد ست۔ روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسۂ زر زناں، و در حسرتِ زرِ تلف کردہ زاری کناں۔ ایں کہ فلاں و بہماں را از نزدِ خویشتن راندہ است، حقا کہ روے در مصلحتے نداشت، و ہر چہ کرد، از بیخردی و ابلہی کرد۔ چہ اگر دانا بودے، و خرد داشتے آناں را کہ راندہ است، نہ راندے، و کارہا از آناں گرفتے۔ و ایناں را کہ با خود در یک پیرہن جا دادہ است، چوں غبار از دامن افشاندے، و ہرگز بہ ہواے ایناں نرفتے۔ کودکی و بے حاصلی ورزید، مگر در ایامِ صاحبزادگی و ولیعہدی؛ از آناں دلے پُر داشت و با ایناں لختے رام بود۔ از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن، و در دامِ ایناں بدیں کوری در آمدن، نہ بفرمانِ دانش ست، نہ بفرمانِ بینش۔ حکیم کرا میگوئی؟ و کرم پیشہ کرا میخوانی؟ ..... چوں سخن دریں باب بسیار ست، نامہ بہ دعا ختم می کنم۔ دیدہ را بینشے درست و دل را دانشے سودمند روزی باد۔"

مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ جن سے مرزا باندے میں مل کر کلکتے روانہ ہوئے ہیں۔ کلکتے میں پہنچ کر ان کو سفر کی تمام رویداد لکھی ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"روز سہ شنبہ چارم شعبان پارۂ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید۔ غریب نوازیہاے وہابِ بے منت را نازم کہ در چنیں دیار خانۂ چنانکہ باید، و ہر گونہ آسایش را بکار آید؛ ہم اورا باندازۂ فراغِ خاطرِ آزادگاں فضاے، و ہم اندرو مانندِ دہانِ آزِ دنیا طلباں بیت الخلاے۔ در گوشۂ صحن پُر از آبِ شیریں چاہے و برطرفِ بام در خورِ اہلِ تنعم آرامگاہے۔

بے آنکہ جستجوئے رود، یا گفتگوئے شود، بے منت و بے زحمت بکرایۂ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید، و آدم و چار دارا تکیہ گاہِ آرامش گردید۔ دو روز از رنج راہ آسودہ منشور لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علی خان) را مشعلِ راہِ مُدّعا ساختم و در کشتی نشستہ آہنگِ ہگلی بندر کردم۔ لطفِ ملاقاتِ نواب علی اکبر خان طباطبائی، اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد، رواست؛ و اگر گویم کہ مرا بر من برشک آورد و نیز جا دارد بخدائیکہ خرد آفریدہ و خرد ور برگزیدہ، بدیں گرانمایگی و صاحبدلی در بنگالہ دیگرے نخواہد بود۔ یارب! ایں گوہرِ گرامی از کدام کان ست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامیں دُودماں۔ بارے چوں نخستیں صحبت بود، بچارہ جوئی و مصلحت پُرسی دردِ سر ندادم، و دو سہ ساعت نشستہ بنکدہ باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روز ہا نواب را با محکامِ ہگلی در خصوصِ زمینے کہ وقفِ امام باڑہ است معارضہ درپیش و دل سرگرمِ فکرِ کارِ خویش ست۔ و للہ دَرُّ القائل۔

ہمہ را ماتمِ حسرتِ دنیا دیدم — چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرمانبر و بخت فرماں پذیر باد۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

"از نوادرِ حالات اینکہ سخنوران و نکتہ رسانِ ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزمِ سخن آراستہ بودند۔ در ہر ماہِ شمسی انگریزی روزِ یکشنبۂ نخستیں سخنگویاں در مدرسۂ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے۔ ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است، دراں انجمن می رسد، و اشعارِ مرا شنودہ بآہنگِ بلند می ستاید، و بر کلامِ نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسّم ہائے زیرلبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذات مفتونِ خودنمائی ست، ہمگناں حسد می برند، و کلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بر دو بیتِ من اعتراضِ نادُرست برآوردہ، آنرا شہرت میدہند۔ وبے آنکہ مرا زباں بپاسخ شنا شود، از دانشوراں کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خان

و مکری و مطاعی مولوی محمد محسن از آنانند، جوابہا می یابند، و پس زانوے خوشی می نشینند - چنانچہ ہم بہ فرمانِ ایں دو بزرگوار مثنویے انشا کردہ ام، و بعد از اظہارِ عجز و انکسارِ خویش جوابہاے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ، و آں مثنوی (یعنی مثنوی بادِ مخالف) پسندیدۂ طبع عالمے افتادہ است۔ انشاء اللہ العظیم زیں بعد عریضہ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید، ورقے ازاں ابیات درنوردِ آں خواہد بود۔"

نواب ضیاء الدین احمد خان اکبر آباد گئے ہوئے ہیں۔ مرزا ان کو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلّی سے اس طرح لکھتے ہیں:

"جانِ برادر! اشک و آہِ غالبِ نامراد، یعنی آب و ہواے اکبر آباد بہ شما سازگار باد۔ گرفتم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدیک خود (یعنی بدانستِ خود) از من دورتر رفتہ آید، امّا چوں ہنوز در وطنید ہمانا کہ نزدیک بامنید۔ شادم کہ شوقِ دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد۔ تا ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) دادِ شادمانیِ دیدارِ وطن نیز توانم داد۔ زینہار، اکبر آباد را بچشمِ کم (یعنی بچشمِ حقارت) ننگرند، و از رہگذرہاے آن دیار، الحفیظ گوے، و الاماں سراے، نگذرند کہ آں آبادِ چہ ویران و آں ویرانۂ آباد، بازیگاہِ ہمچو من مجنونے، و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خونی ست۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمین جز مہرِ گیا (نام رستنی)، نہ رستے و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ)، بہ مستانہ وزیدن، دلہا را آں مایہ از جا بر انگیختے (یعنی بشورش آوردے)، کہ رنداں اہواے صبوحی از سر و پارسایاں را نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرّۂ خاکِ آں گل زمین را از تن پیلے بود دلنشیں، و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں دردے بود خاطر نشاں، امّا تازگیِ وقتِ شما یا در نظر داشتہ، در دو پردہ شورِ پرسش بر انگیختہ بود، و چشم براہ داشت کہ کے نویسند و دریغ کہ ہیچگاہ ننوشتند کہ رخشِ سنگیں (یعنی اسپِ سنگیں کہ در اکبر آباد معروف است)، دعاے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا بہ پاسخِ سلامِ من بہ زبانِ موج چہ گفت؟"

نواب عبداللہ خان صدر الصدور میرٹھ برادرِ نواب محمد سعید خان مرحوم رئیسِ رامپور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیسِ ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو۔ مگر اس زمانے میں مرزا پریشان بہت ہیں۔ اس لیے ان کے جواب میں لکھتے ہیں:

"خدامِ بلند مقام کہ سرانجامِ قصیدہ از غالبِ بے نوا چشم داشتہ اند، مگر آں فرسودہ روانِ افسردہ دل را کہ ہنوز نہ مُردہ است، زندہ پنداشتہ اند۔

گمانِ زیست بود بر مَنَت ز بیدردی   بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

کاش گشایشِ ایں کار چوں صنعتِ نقاشی و گلدستہ بندی تنہا بکوششِ دست و بازو صورت بستے، تا چشم از خستگیِ دل پوشیدمے، و فرمان پذیرانہ در پردازشِ کار کوشیدمے۔ چہ کنم، چوں سرِ ایں رشتہ دردستِ دلست، تا دل برجائے نباشد، زبان سخن سرائے نباشد۔ دیدہ ورانِ صاحبدل دانند کہ چہ قدرہا دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے، بداں شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند۔ انگیختہ شود۔ ایں دل شکستہ بہم نہ پیوستہ کہ در سینۂ من و ہمانا دشمنِ دیرینۂ من ست، زنہار بکارِ سخن گستری نباید و سعنی آفرینی را نشاید۔۔۔۔"

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اول ہی مرتبہ اصلاح کے لیے بھیجی ہیں، اس کے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں:

"خواہشِ حک و اصلاح مہر افزود۔ چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم، نازیبا صورتے بنظر درنیامد۔ ہنجار و روش خود از نیروہائے درونی ست۔ آرے، نئے خامہ در بُنانِ ہرکس خرامے دیگر دارد؛ آموزش را دریں پردہ راہ نیست۔ و اگر گویند، ہست ہر آئینہ می توانم گفت کہ نیست، مگر بہ ہمنشینی و ہمزبانیِ آموزگار، و بسر بردنِ روزگار در سَرہ کردنِ گفتار۔ چوں صحبت صورت ندارد، و گفتہ آمد کہ ہرچہ بہر نمط گفتہ اند، نہ غلط گفتہ اند، می باید حلقہ بر درِ دل زد و ہمت از مبدأ فیاض دریوزہ کرد، بکثرتِ مشق، و فراوانیِ ورزش، و پیرویِ رہروانِ راہ دان کشاکشہا رُوئے خواہد نمود، و اندیشہ را دستگاہ و گفتار را سرمایہ خواہد افزود"

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے، خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے۔ وہ خط بجنسہٖ لکھا جاتا ہے:

سبحان اللہ! باآنکہ از فرامش گشتگانم، دانم کہ دوست مرا بہ دو جو بلکہ بہ نیم خس برنگیرد۔ ہرگاہ بسار دادنِ آہنگِ گلہ رُوے آرم، وسنجم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، واز قہرمانِ اندیشہ دور باشے (یعنی امتناعے)، درمیان نیست۔ ہر آیینہ بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست رُوے سخنے ہست، آنچناں برخویشتن می بالم کہ غم جانگداز فراموشی فراموش، ولب از زمزمہ کہ دل در بندِ سرودنِ آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

از خویشتن بذوقِ جفا با تو ساختیم   با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہواے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعُرفیؒ گفتہ آید۔ چوں کوششِ اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند و نہ مرا جائے، ناگزیر آں ابیات را بہ کسے عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را سخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہر یک بہر یک تواند نمود۔ والسّلام“

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجاے خود ایک دفترِ طویل الذیل ہے، کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کر کے لکھی ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں، مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے، اس لیے ہم اسی قدرِ قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے ان مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں، چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی

جائیں، ان کو ایک دوسرے کے محاذی لکھ دیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا کہ کونسا مضمون کس پائے کا ہے اور کون سا کس درجے کا، ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والیِ بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں، جن میں سب سے پہلے معرفتِ الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں ان کو بادشاہی اور درویشی کا جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ ہم دونوں کتابوں سے وہ مقامات مقابلِ یکدگر نقل کرتے ہیں:

ظہوری	غالب
تاجداریِ لفظ و معنی بہ حشمتِ ثانیٔ تارک آرنیست کہ سمی خلیل خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را در ہفت اقلیم بہ نُہ صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ۔ اوّل معرفت کہ باوجود حُجُبِ کثرت در مشاہدۂ شاہدِ وحدت معنی کلام معجز نظام "لو کُشِفَ الغطاء ، لَما ازددت یقیناً" وصفِ حال او ساختہ، گلستانِ نیت و بوستانِ عقیدتش از خس و خاشاکِ شک و شبہہ پرداختہ مجموعۂ عرفانِ موحّداں فردے از دفترِ شناسائیش عُنُف و اُشتُلم ماسوے	ازانجا کہ بعدِ ہر دَور طورے دیگر ست، و پس از ہر انجام سر انجامے جداگانہ؛ در ہر عہد، عہدِ اسمے دیگر است (یعنی اسمے دیگر از اسمائے الٰہی)، و در ہر وقت وقتِ کشایشِ طلسمے دیگر، فرۂ ایزدی (شانِ الٰہی) کہ چندے را بنام آوریِ شکوہِ عزّ و غنا از سیما درخشیدے، و اندے را بنشانمندیِ فقر و فنا فروغ بخشیدے، مظہرے کامل و مرآتے روشن خواست۔ تا دراں مظہر ظہورِ ہر دو رنگ، و دراں مرآت رُویتِ ہر دو صورت، یکبارہ رُو دہد۔ اورنگ و منبر یکے شد و وسادہ و سجادہ را دوئی از میان رفت۔ درفشِ کاویانی ، کہ نشانِ

پسندیدۂ طبعِ مواسائیس بہ توضیحِ بیانش نشانہاے بے نشاں (یعنی ذاتِ بے نشاں) ہمہ دلنشین و خاطر نشان۔ بہ آفتابِ جہاں گرد تاکیدِ نظر بر دو بینان نیند اختن و بہ مصورِ قضا تہدید باحوالِ احولاں نپرداختن زنار را بہ سبحہ نہ پیوندیست کہ گسیختنش برکشاکشِ کشیشاں (یعنی قسیساں) نہ خندد، وکفر را با ایماں نہ سریست کہ صُداعش صندلِ چارہ از پیشانیِ برہمناں نبرد۔ از صدمۂ توحیدش دوئی در یکی گریختہ، و بہ علاقۂ تجریدش خودی در توئی آویختہ گوشے حق شنو، چشمے حق بین، دلے حق جو، خاطرے عرفان زا سینۂ معرفت خیز، تارکے آسمان سا، جبہۂ سجدہ ریز

بادشاہی است) از عصا و ردا کہ ہر دو شعارِ درویشاں و ہر دو در درفش جمع آمدہ) منّت پذیرفت کہ پیدائیِ من بہ پیوندِ ایں دو جزو بازبستہ است، و عصا و ردا درفش را سپاس گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقشِ جمعیتِ ما رسا نشستہ است۔ بیکدگر خوردنِ ایں دو قدح (یعنی فقر و سلطنت) مجمع البحرینے پدید آورد، و سرِ ہم آوردنِ ایں دو قوس نقشِ دائرہ پدیدار کرد۔ از سرجوشِ فروغِ مہر و ماہ بافشردن و پالودن و سرشتن پیکرے ساختند و بہرِ دفعِ گزندِ چشمِ بد از پروین و پرن براں پیکر سپند سوختند سرش را بتاجِ شاہی افراختند و دلش را بنورِ الٰہی افروختند.... زہے در انجمن خلوت نشین و بہ پادشاہی کار آگہی گزیں۔ پادشاہاں در انجمن ازاں کار آگاہ ادب آموختہ، و کار آگاہاں در خلوت ازاں پادشاہ فیض اندوختہ۔

ظہوری

مثنوی

پاے رفعت بر آسماں دارد
سرِ خدمت بر آستاں دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
رازِ او طرزِ حق پرستیدن

غالب

مثنوی

اے کہ از رازِ نہاں آگہ نۂ
دم مزن ازرہ کہ مردِ رہ نۂ
"در ہزاراں مرد، مردِ رہ یکیست
آدمی بسیار، اما شہ یکیست"

۔ مسند

خلوتِ دیگران و صحبتِ او
وحدتِ این و آن و کثرتِ او
در دلش این و آں نمی گنجد
ہیچ جُز حق دراں نمی گنجد
بت شکن گشت چوں خلیل نخست
بادش ارزانی اعتقادِ درست
کفر در فکرِ نکتۂ عرفاں
شرک در شکرِ نعمتِ ایماں
طینتش باج خواہِ طینت ہا
نیتش پادشاہِ نیت ہا
در عبادت زہے تومندی!
بندگی در خورِ خداوندی
سرِ وحدت بمغز بُردہ از پوست
ہمہ او کرد خویش را، ہمہ اوست

ور تو می پُرسی کہ مردِ راہ کیست
جُز سراج الدین بہادر شاہ کیست
در طریقت رہنماے رہرواں
در خلافت پیشواے خسرواں
آنکہ چوں از رازِ وحدت دم زند
دفترِ کون و مکاں برہم زند
آنکہ چوں در نے نوا یا سر دہد
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد
شبلی، از منبر دہد آوازِ عشق
شاہِ ما، بر تخت گوید رازِ عشق
عشق دارد پایہ در ہر کس نگاہ
منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعدِ ترکِ مسندِ جم یافتست
شاہِ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی
شاہی و درویشی اینجا باہم ست
پادشاہِ عہد قطبِ عالم ست

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے، اس میں وہ فخریہ فقرے جو اس نے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں، اسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوان فارسی کے دیباچے میں انشا کیے ہیں۔ سو دونوں دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کر کے اس مقام پر ہم مقابلِ یکدگر لکھتے ہیں:

حزیں

ہمایوں خطے ایست لبالب از جواہر کلم و جوامع حکم۔ روح پرور ہوائش ربیعی اعتدال و جداولِ سطورش ازما، معین مالامال، خاکش مشکیں نفس و شمیمش عنبر آگیں، آبش خمار شکن و نسیمش مسیح آئین، از صبوحی فیضے کہ ساقیِ کلکش پیمودہ، سیاہ مستانِ حروف سر درکنار ہم غنودہ اند، واز نشۂ ہوش پروازے کہ دستِ فکرت در جام و سبوے الفاظش ریختہ، خرد مستانِ معنی نشیدِ شوق سرودہ۔ بنام ایزد حسنِ لیلیٰ ست کہ طرفِ خیامِ الفاظ سر بر زدہ در جلوہ گری ست، یا شورِ مجنونے ست کہ از وادیِ تفیدہ دل برخاستہ در پردہ دریست یوسفستانے ست از گل پیراہناں در موج نگارستانے ست سیمیں بدنانش فوج در فوج، سہی پیکرانند در خیابانِ سطور دوشا دوش، مغان شیوہ دلیرانند از بادۂ ناز گرم نوشا نوش، نازک بدنانند حجاب پرورد گل

غالب

بنامِ ایزد نخستیں نقابیست از روے شاہدِ ہر ہفت کردۂ معنی بجنبشِ نسیم برافتادہ یعنی کشاکشِ دستِ ناکشیدہ۔

بازپسیں چراغیست از گرمیِ چراغانِ نیم سوختہ، پہلو رخ بہ افروختن دادہ، یعنی داغِ منتِ خس نادیدہ کہن داغہاے جنون ست سراسر بہ ناخنِ شوخیِ نفس خراشیدہ۔ گرماگرم خونابہ دردنست بہ تفِ پنہانیِ دل ناگہ از ناسور تراویدہ۔ کاغذی؎ پیرہنانند (یعنی دادخواہانند) چوں پیکرِ تصویر از حیرتِ واقعہ خاموش (یعنی اپنی بیقیدی سے حیران ہیں) شعلہ بکف گرفتگانند (یعنی فریادیانند) چوں آذر از دودِ دلِ سیہ پوش ..... نگویم دُود و چراغست با لالہ و داغ، اما سوختگی را سرگذشت ست و خستگی را روداد۔ نگویم تجلی و طور است، یا جنت و حور، اما نازش را قلمروست و آرامش را سواد (نواح) طلسمِ شعلہ و

؎ الفاظ کو اس لیے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں، کاغذی پیرہن کہا ہے اور کاغذی پیرہن دادخواہ کو کہتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں معانی کو اس لیے کہ ان کی روشنی حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے شعلہ بکف اور سیہ پوش کہا ہے

پیرہنانند تنہا گرد، پختہ مغزانند برشتہ پوست، بیگانہ نغزانند آشنا دوست؛ صوفیانند در وحدت خانۂ عشق مست سماع، سوختگانند سپند آسا سرگرمِ وداع، درویشانند تجرد کیش، فروکیشانند از ہمہ در بینش، شیر صولتانند از جوشنِ خط پلنگینہ پوش، دریا دلانند از شورشِ عشق در جوش و خروش؛ آئینہ پیکرانند آئینہ تاب، پاکیزہ گوہرانند یکسر خوشاب، گلبرگہاے شبنم زدۂ بہاریست خراشیدہ ناخنہاے بلبلِ شاخساریست۔ دُود ست، باز بستۂ زردشت خیال؛ شعلہ پنہاں، و دُود پیدا، دل لوحِ طلسم و زبان طلسم کشا۔ ہنگامۂ ابرو باد ست برانگیختۂ جادوے فکر؛ ابر گہر پاش و باد الماس فشاں، اندیشہ طومارِ نیرنگ و لب افسون خوان، دُود کبابیست باندازِ پیچ و تابے کہ از شعلہ در دل افتادہ ست، بر ہوا تتق بستہ خیلِ غزالے ست بسامانِ چنیئے کہ در کمین گاہ رُو دادہ است۔ از دامِ بدر جستہ جمالیست در پردۂ نمایشِ خویش مشاطۂ حقیقی آرایش نگار۔ نہالے ست در سایۂ برومندیِ خویش نخلبندِ ازل را سپاس گزار۔

مرزا اور ابو الفضل کی طرزِ بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں، جو شیخ کے اکبرنامہ میں مذکور ہیں؛ مگر چونکہ مرزا نے ان واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے، اس لیے دونوں کتابوں کی طرزِ بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادا واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں:

اکبرنامہ	مہر نیمروز
ترک بزرگترینِ فرزندانِ یافث بود۔ ترکان او را یافث اوغلان گویند؛ و بہوشیار دلی و کارگزاری درعیت پروری	ترک ابنِ یافث نشانِ جہانداری یافت و ترکان ایں والا شکوہ را، ازاں رُو کہ بہ ترکی شہر یارِ جواں را

از ہمہ برادران امتیاز داشت۔ بعد از رحلتِ پدر بر تختِ فرمانروائی نشست، و دادِ مردی و مردانگی و مظلوم پرستی داد۔ و در جاے کہ ترکان اُو را **اسلول باسلیکائی** میگفتند و چشمہ ہاے آبِ سردِ خوشگوار و گرمِ عافیت بخش و مرغزار ہاے دلکش داشت، اقامت فرمودہ۔ از چوب و گیاہ خانہ با اختراع کردہ، و خرگاہ پدید آورد و از پوستِ بہائم و سباع لباسِ پوشیدنی دوخت، و نمک در زمانِ او ظاہر شد۔ و در آئینِ آوان بود کہ پسر را بجز شمشیرے میراث ندہند و تمام خواستہ دختر را باشد و گویند اُو معاصرِ کیومرث اوّل ملوکِ عجم ست، و او اوّل سلاطینِ ترکستان است، و عمرِ او دویست و چہل سال بود۔ **النجہ خان** بہترین فرزندانِ ترکی بود۔

اوغلان گویند، یافث اوغلان گفتند۔ دارو دانش آئین داشت، و دریں ہر دو شیوہ روشہاے گزیں داشت۔ خانی و مرزبانی را فرہنگ ہا پدید آورد، و فرماندہی و فرمانبری را اندازہ بر نہاد و نزہتگاہ **سیلول باسلیقا** را کہ چشمہ ہاے رواں و گل و میوہ فراواں داشت، از بہرِ آرامش گزید از نَے و عَلَف و چوب و گیاہ نشیمن ہا افراختے، و پوستِ دام و دَد را پوشش تن ساختے۔ گویند نمک بہ روزگارِ وَے پدید آمد، ورنہ ازاں پیش ترہ و گوشت ہمچناں بے نمک ہمی خوردند۔ ترکانِ شمشیر زن را بفرمانِ فرزانہ شیر افگن (یعنی یافث اوغلان) بر نہاد (دستور) و قرارداد آں بود کہ ازاں ہمہ برگ و ساز کہ از مردہ مروری (میرث) باز ماند جُز شمشیر بہ پسر

اکبر نامہ

چوں پیمانۂ زندگی ترکی پُر شدن گرفت، او را بشورۂ بزرگان بر تختِ سلطنت نشاندہ او خردِ دوربین را پیشواے خود ساخت؛ در عدالت گستری روزگار گذراند۔

مہر نیمروز

ندہند و ہمہ بدختر باز گزارند کہ ہر آئینہ تیغِ جوہر دار فردِ فہرستِ گنجینۂ سیم و زر بلکہ کلیدِ فتحِ ہفت کشورست۔ اگر بدیں پلارکِ الماس گوں دسترس ست، مرد را دست مایۂ ناز بس ست۔ بالجملہ ایں ہمہ رسم و آئین نہاد و پایانِ کار پس از دویست و چہل سال بیداری بخوابِ عدم سر بر زمین نہاد۔ بزرگانِ دودہ پس از یافث اوغلان بہ فرزندِ بخت بلندش **ایلنجہ خان**

چوں پیر شد عزلت اختیار فرمود۔ **دیباقچی** بعد از عزلتِ پدر و اشارتِ عالیش فرماں روا شد۔ **کیوک خان**، فرزندِ شید اوست پدرش در ہنگامِ پدرود کردنِ جہان سریرِ خانی باو عنایت فرمود۔ او قدرِ سلطنت را دانستہ در لوازمِ آں اہتمام بجاے آورد۔ النجہ خاں پسرِ اوست در آخرِ عمر

چشمِ روشنی گفتند۔ کلاہِ کج نہاد و راستی پیشہ گزید۔ بدی پیرامونِ دلش نگذشتے، و با بداں ہمزباں نگشتے۔ آزادہ رَو بود، و دل بیادِ یزداں در گرو داشت۔ تاج و تیغ و نگین در زندگانیِ خویش، بہ نوبادۂ باغِ کامرانیِ خویش **دیباقچی خان** جواں بخت نوجواں سپرد و خود ازیں خارزار دامن برچید، و بہ آفریں خانہ کہ تواں را صومعہ گوئی، آرمید۔ دوصد و پنج سال پارۂ بنموداریِ اقبال و پارۂ بپرستاریِ ذوالجلال در جہانِ گذراں ماند، و بہنگامِ ناگزیر درگذشت۔ دیباقچی خان کہ ہم در نظارگاہِ پدر اورنگ آرائے بود، اورنگِ خسروی را بہ نمطے "تازہ" آراست، امّا بدیں دانشوری و دادگری کہ جُز دانش نہ جُست و جُز داد نہ کرد۔ روزنامۂ عمرش چوں رقم یک صد و ہشتاد و شش سالگی پذیرفت، درنوشتند؛

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور ان کے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اس کا دکھانا مقصود تھا، ختم ہو گیا۔ مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب ان تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی، جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے اور جو اہلِ وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں کیوں کہ اس مضمون کے لکھنے پر ہم کو اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے۔ جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پَر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن می رسد از دل بلبِ ما　　　عشق ست کہ بربستہ زبانِ ادبِ ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا

آتا ہے، اس کو چاہو، اس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ اور چاہو، اس یقین کا ثمرہ خیال کرو، جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے، اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اس کے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضا سے، نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے، اس سے لوگوں کو بواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے، گو اُن کو خود یہ خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی سعی محض بے حاصل اور ان کی کوشش سراسر بیسود ہے۔ اسی طرح کوئی ذرہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظامِ کلی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

لے کہ تو ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روے نیست   در طلبت تواں گرفت، بادیہ را بہ رہبری

یادگارِ غالب کو ہم نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی لائف یعنی ان کی زندگی کے حالات اور اُن کے اخلاق و عادات کا بیان ہے، اور دوسرے حصے میں ان کے کلام کا انتخاب۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں، جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں، کوئی مہتم بالشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا، بایں ہمہ اس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہلِ وطن کے لیے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے، جب چچا کا انتقال ہوا۔ ان کی ننھیال جہاں انھوں نے پرورش اور نشوونما پائی آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری تھی جس کے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعانک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفّہ

نانا نانی کی ناز برداریاں، اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا، یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں ان کا جادۂ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہولی، نشے ہرن نہ ہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے، مگر وہ جو مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو آجائے، تو بھولا نہ جانو" انھوں نے اپنے فضل و کمال، حسنِ معاشرت، شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق سے، جو کہ ان کے ذاتی جوہر تھے، وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا۔ جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا، اس کو اخیر عمر تک نبھا دیا؛ غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اس کا خیال نہ چھوڑا؛ اور باوجودے کہ زمانہ قدر دانوں سے خالی تھا، اُس کو اُس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اس کا منتہاے کمال تھا۔

اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ جن اعلےٰ تعلقوں میں بچپن اور جوانی گزری تھی، اُن کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ اخیر دم تک خُور بعد الکوَر میں مبتلا رہے۔ اس کے سوا امراضِ جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سوہانِ روح رہا۔ باوجود اس کے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک ان کی رفیقِ حال رہی۔ اگرچہ نظم و نثر میں جو زارنالیاں انھوں نے کی ہیں، وہ بظاہر بیصبری اور تنگ حوصلگی پر، جو ایک اخلاقی کمزوری ہے، دلالت کرتی ہیں، لیکن درحقیقت یہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا، جس کی زمین ان کے پاؤں کو لگ گئی تھی۔ اوّل تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم ہے؛ دوسرے ہر شاعر ایک خاص راگنی کا کلاونت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعرا میں امراؤالقیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا۔ اعشیٰ حسنِ طلب اور وصفِ شراب میں ضرب المثل تھا، اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں فردوسی

رزم کا دھنی تھا نظامی بزم کا، اور سعدی موعظت کا۔ چوں کہ مرزا خاص کر رنج و مصیبت کے بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اس لیے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا۔

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ، اس وجہ سے کہ زمانہ اُس کے اندازہ کرنے سے عاجز تھا، پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا، نہیں بٹھا سکے، مگر وسعتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، اور صلح کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے، دوستوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی؛ اور ہر ایک کے ساتھ ان کے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں ان کے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھ کر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی، اور ان کی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاسِ وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دارالخلافہ کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں، اُن کی ذات میں جمع تھیں۔ خصوصاً وفاداری، حق شناسی، اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم خاندانوں کا شعار تھا، مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ چوں کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان لارڈ لیک کی مہمات میں شریک رہے تھے، اور ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ نے ان کے پسماندوں کے لیے، جن میں سے ایک مرزا بھی تھے، کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کر دیا تھا، مرزا نے، جیسا کہ ان کی تحریرات سے ظاہر ہے؛ اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا: بلکہ تمام عمر ملکہ معظمہ اور ویسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اوراد اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی؛ بعض افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے لکھے، اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ

دامنِ دولتِ انگلشیہ سے بچتے رہے۔ غدر کے زمانے میں فوجِ باغی کے ظلم و ستم نے جو اثر ان کے دل پر ہوا تھا، وہ ان کی کتاب دستنبو سے جو غدر کے حالات پر اسی شورش و فتنہ کے زمانے میں انھوں نے لکھی تھی، ظاہر ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دہلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ ان کو پہنچا تھا۔ وہ ان کے اس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ہی انھوں نے لکھا تھا، ظاہر ہے۔ وہ اس خط میں لکھتے ہیں:

> یکے از ستمگرانِ ناخداترس کہ بعذابِ ابدی گرفتار باد، ولیم فریزر را کہ رزیڈنٹ دہلی و غالبِ مغلوب را مربی بود، در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کشت، و ماتمِ مرگِ پدر تازہ کرد۔ دل از جائے رفت، و سترگ اندوہے سراپائے اندیشہ را فرو گرفت۔ خرمنِ آرامیدگی پاک بسوخت و نقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر سترده شد۔

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصنافِ سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے جا بجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اہلِ جاہ کی بھٹی میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا، اس کی تکمیل ان کے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی کیوں کہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی صنف سے ہوئی۔ اور کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا، وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا، اس کو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیے، اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے۔ بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہلِ دنیا کی مدح میں انشا کیے ہیں، ان سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی، یہ ہے کہ ان کا ممدوح مخاطبِ صحیح ہو یا نہ ہو، اور اس سے حسنِ کلام کی

داد ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو، وہ ہمیشہ قصیدوں کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمالِ شاعری اسی طرح ظاہر کرتے تھے، جیسے متنبّی، سیف الدولہ کی یا عرفی، خانخاناں کی تعریف میں کرتا تھا۔ مع ذلک چند قصیدوں کے سوا جو دوستوں کی ترغیب و تحریص سے انھوں نے کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیس کی مدح میں لکھے ہیں، باقی ان کے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں، یا اپنے معزز اور لائق ہمعصروں کی تعریف میں، اور یا ان لوگوں کی شان میں جن کو وہ اپنا مربّی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جن کی مدح سرائی کا فرض بطورِ شکرگزاری و منعم پرستی نہ بامیدِ صلہ و انعام ادا کرتے تھے، جیسے قلعۂ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکۂ معظمہ اور ویسرایانِ کشورِ ہند، اور دیگر اعیان و ارکانِ سلطنتِ انگلشیہ یا فرمانروایانِ ریاست رامپور و الور وغیرہ۔

باایں ہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہلِ دنیا کی مدح سرائی پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوانِ فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

> درہوائے کہ بال بالا خوانی زدہ و در ادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اس قدر فخر کیا ہے)، نیمہ ازاں شاہد بازی ست، (یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے)، و نیمۂ دیگر تونگرستائی ست، (یعنی بادخوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے)۔ بیداد بین کہ ہرجا بشانہ خمے از زلفِ مرغولہ مویاں کشودہ شود بلا در من آویزد، تا دل بہ پیچاکِ آں شکن بندے؛ و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے براورنگِ سروری کج نشیند، ہوس مرا برانگیزد، تا بہ پیشش بندہ وار ستمے۔ شادم از آزادی کہ بہ سخن بہ ہنجارِ عشقبازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدحِ اہلِ جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر لختے بہ چامہ و چنگ سرآمد و پارۂ بہ دروغ و دریغ رفت۔

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہم کو لکھنا تھا، لکھا گیا۔ اب

ہم چند سطریں ان کے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں۔

ہم نے اس کتاب میں، جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے، مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری و انشاپردازی کی غیرمعمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی، جہاں تک کہ ان کی نظم و نثر اس پر شہادت دے سکتی ہے، صاحبانِ ذوقِ سلیم پر واضح و لائح ہو جائے۔

اگرچہ فی الحقیقۃ طریقۂ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے۔ لیکن بالفرض اس کا پورا ہونا تسلیم کر لیا جائے، تو بھی بظاہر اس سے کوئی فائدہ متصوّر نہیں۔

زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے، اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقہ کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اس کا نعم البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے۔ نظم و نثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو باتیں پہلے محاسنِ کلام میں داخل تھیں، اب ان میں سے اکثر داخلِ عیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے، اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا، مگر زمانے کا رُخ قدیم شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے اور آیندہ تمام قافلوں کو، جو اس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کر لیا جائے، تو بھی اس زمانے میں ان کی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور ان کے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا، بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے، جس کا وقت گزر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، اس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے، ایسی یورپ کی موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی

شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ کرتے اور اس سے صدہا اسلوبِ بیان اخذ کرتے ہیں، تو ہمارے ہم وطن کیوں کر اس سے استغنا کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جس طرح زمانۂ حال کے انجنیر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجنیرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں، اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے، اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے، مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہییں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے، اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہم نے اس کتاب میں دکھایا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق کے موافق نہ ہو لیکن اس سے مرزا کے کمالِ شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعراء جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے، آج اہلِ زبان ان کی طرزِ شاعری کو نام رکھتے ہیں، خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں، اور جن میں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں جنھوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہدِ حکومت میں ایران یا ہندوستان میں عَلمِ امتیاز بلند کیا تھا، ان کی شاعری کو جیسا کہ رضا قلی خان ہدایت نے اپنے تذکرہ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے، آج اہلِ زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا، سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کی تتبع کا دم بھرتے ہیں، حال آنکہ متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گذرے ہیں، جن کے کمال اور استادی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشا پردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہونا، اس کے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی، وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا؛ وہی چند میدان جن میں انھوں نے اپنے گھوڑے دوڑائے تھے، ہمیشہ مرزا کے جولان گاہ رہے۔ لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، اس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رخ کرتا ہے، اُدھر اپنا راستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے، اس کو کامیابی کے ساتھ طے کر جاتے۔ وہی بارود جو آتش بازی میں بچوں کا جی لبھاتی ہے، جب اس کو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے، تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز تھی، جس نے کہیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حبِ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگا دی۔

اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا؛ پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی، ویسی متاخرین میں نہیں ہو سکتی؛ یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے، ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکۂ شاعری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے، جیسی مصوری کی قابلیت یا سریلی آواز۔

جس طرح ان دونوں صفتوں کا ہر زمانے اور ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے، اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف شانوں میں ظہور کرتا ہے، اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہے، وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اس کا مذاق ہے۔ انیس اسی ملکۂ شاعری کے ساتھ جو اس کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا، اور اسی سوسائٹی میں نشوونما پاتا، جس میں فردوسی نے نشوونما پائی تھی، تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ

پاتا جو فردوسی نے پایا تھا۔ اور فردوسی اسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اس کے دماغ میں ودیعت کی تھی، اگر ہندوستان کی اس سوسائٹی کے سایہ میں پلتا، جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا، جو انیس نے اختیار کی تھی اور اس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متاخر شاعر کہتا ہے:

نیست اندر زمانہ **محمودے**　　ورنہ ہر گوشہ صد چو عنصریست

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں:

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

مرزا نے جس وقت شعرِ فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا، اس وقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا: ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز، جو اکبر کے زمانہ سے چلی آتی تھی؛ دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شائع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم ہوگئی۔ جو لوگ شعرِ فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے، وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل ان سے بہت زیادہ مقبولِ خاص و عام تھی، مگر ان وجوہات سے جو متاخرین کو طرزِ جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے حصے میں کر چکے ہیں، مرزا نے اول بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر اس نظر سے کہ اہلِ زبان اس طرز کو ٹکسال سے باہر خیال کرتے تھے، نظیریؔ عرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا ہو، اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید نمونہ نہ دیکھا ہو، وہ سوا اس کے کہ ان کا اتباع اختیار کرے، اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اس نے اس طرزِ شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے، اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے، سو اس کو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے، جیسے دو اور دو چار۔ البتہ جو لوگ شعرِ فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، وہ اکبری دَور

کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد، امید ہے کہ، مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانہ کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس کی روش پر ڈال دیتا، وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے، تو اس کے کلام کی روانی اور بے ساختہ پن دیکھ کر ان کو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا، اس لیے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں، جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا نظیری و عرفی وغیرہم کا، جن کو مرزا خود اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں، ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ سو قطع نظر اس کے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعوے پر قائم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دو اور سوال پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ ایک زباندان آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے، یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشرووں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے، یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں، بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشے میں، اکثر پیرو اپنے پیشرووں کے صرف برابر ہی نہیں، بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے، مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بہ قدم چلے ہیں، مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو جو یقیناً اس کے پیشرو تھے، غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو ان سے پہلے ہوئے،

بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں، بلکہ صرف ان کا ہم پلّہ قرار دیا جائے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔ ایک امیجنیشن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت، جیسا کہ ظاہر ہے، ممکن ہے کہ ایک زباندان بہ نسبت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضلِ متبحر کے، اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواصِ اہلِ شہر کے، بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت، اگرچہ بظاہر اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے، اہلِ ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت، جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے، لکھتے ہیں کہ ”ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے۔“ پس فارسی زبان، جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے، اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحائے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہلِ زبان میں شمار کیا جائے۔

مذکورۂ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکۂ شاعری کے لحاظ سے اکبری دور کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں، یا ان سے کم سمجھیں، یا ان کے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت، سو اس کی نسبت دوسرے حصے میں جابجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحبِ زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحّص اور کثرتِ مطالعہ اور غواصیِ فکر اور مشقِ سخن اور خاص کر اپنی خداداد لٹریری قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا، جس سے ایک زباندان مثل اہلِ زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک ان کا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یورپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے۔ اس کا میدان اسی قدر وسیع ہے، جس قدر نیچر کی فضا۔ اس کے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہییں، ادا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اس طریقۂ شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اس کی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاص کر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انھیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں، نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا، یہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہٖ ایک بہت بڑا کمال ہے، لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے، جس کو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے، اور بشرطیکہ اس میں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو، اس کو شعرائے اہلِ زبان کی طرح، بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے کیوں کہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے؛ اس نے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بے شک چند مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحبِ آتشکدہ نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد نگفتہ است" اور باقی کی نسبت اس کا یہ قول ہے کہ "بسیار بد گفتہ"۔ حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق، عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے:

مثنویش طرزِ فصاحت نداشت
کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے، مگر اس کا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا، بخلاف مرزا کے کہ اس کو مثنوی پر بھی تقریباً اسی قدر قدرت ہے، جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیریؔ عرفیؔ دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان

میں بہت فروغ ہوا ہے، مگر اس میں اول سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و ستایش کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں، جس سے لکھنے والے کی قدرتِ بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرزِ بیان اور اور طرزِ عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر کی جائے، تو بھی اس کے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی، بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرزِ خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا خصوصاً فخر و خودستائی، غم و اندوہ، اور شکایت و زار نالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کیے ہیں، اس کی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین اہلِ ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو ہر شخص آزادی سے اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے، لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہو گئی ہے، اور اس لیے لوگوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھو، پڑھو، سمجھو، اور جانچو۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا؛ مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا؛ اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں، اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں، جو ممکن ہے کہ اہلِ زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے ہوں، مگر ایسی کسروں سے کسی زباندان یا اہلِ زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا، اور نہ ایسی جزوی فروگزاشتوں سے کسی کی استادی میں فرق آ سکتا ہے وللہ درّ القائل:

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در یدِ بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدرِ ضرورت بحث

کر چکے ہیں۔ مرزا کا موازنہ شعرائے اردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہوسکتا ہے کیوں کہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں ان کا کلام کأن لم یکن ہے۔ اور اردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفر محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی روش پر نہیں ہے، مگر خواصِ اہلِ ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں، ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔

مرزا کی نثرِ اردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اس کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے اردو خط وکتابت میں ایک خاص طرز کی ایجاد کی ہے جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اس کی پیروی کی ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا، اور چوں کہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے، اس لیے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔